گمشدہ کلمات

مرزا حامد بیگ

گمشدہ کلمات

مرزا حامد بیگ

دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد

تزئین

سرورق : خالد رشید

پین ورک :

مغل سرائے : یوسف جمال چغتائی

مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'

دل کے موسم' سونے کی مہر'

نیند میں چلنے والا لڑکا : ذوالفقار احمد تابش

گمشدہ کلمات' سرسوتی اور راج ہنس'

بابے نور محمد ے کا آخری بت : مصباح الدین قاضی

ضابطہ

ISBN: 969-496-153-x

کتاب : گمشدہ کلمات

مصنف : مرزا حامد بیگ

موسم اشاعت : 2002ء

مطبع : ورڈ میٹ' اسلام آباد

قیمت : 120.00 روپے

دوست پبلی کیشنز 18اے' خیابان سہروردی' پوسٹ بکس نمبر 2958' اسلام آباد

داراشکوہ کے نام

ترتیب

مزامیر

افسانے

گمشدہ کلمات

مرزا حامد بیگ کے افسانے خط مستقیم میں نہیں چلتے۔ کہا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگار کو عصری صورت حال میں کوئی سیدھا راستہ نظر نہیں آتا یا اس کے کردار زندگی کے پیچ وخم اور اس سے بھی زیادہ اپنے ہی توہمات میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔ شاید یہ جزوی طور پر درست بھی ہو مگر ان افسانوں کی سالمیت ' ان کا پہلودار طرز روایت اور خود صورتحال کی پیچیدگیاں جو ان کے ذریعے محسوس اور معلوم ہو سکتی ہے...... یہ سب خصائص کسی بھی جزوی تاثر کے مدمقابل موجود اور متحارب دکھائی دیتے ہیں۔

مرزا حامد بیگ کے جدلیاتی ذہن کو اکہرے مطالب نکالنے والوں سے وحشت ہوتی ہے۔ اس لیے کہ سہولت کا کوئی بھی راستہ بسا اوقات ممکن ہی نہیں ہوتا۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ زندگی اور ادب کے ازلی اور ابدی تقاضے بے حد مضبوط اور باریک گرہ سے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ ناخن تدبیر کے ساتھ گنجلک کو کم کرنا اس کو بھی آتا ہے مگر وہ آخری اور لازمی گرہ کھولنے کی کوشش نہیں کرتا۔ کیونکہ اس کو توڑے بغیر کھولا نہیں جا سکتا۔

نفس انسانی اور انداز نظر کا یہ لاینحل تضاد یا تقابل اور اس کا ایک حد تک تجزیہ پیش کرنے کی کوشش اوروں نے بھی کی ہے مگر اس دوہری حقیقت کی جلوہ گری کسی یک رخے اسلوب

کے ذریعے نہیں ہوسکتی۔ ''گمشدہ کلمات'' میں ایک طرف تو حساس مشاہدے اور بے خوف گواہی کی زبان ہے اور دوسری طرف وارداتی تخیل کی رسائی کا ابلاغ۔ دونوں قسم کے اظہار ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی پیہم کشمکش میں صفحہ کاغذ پر دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ خطرے کا مقام ہے' مگر افسانہ نگار دیدہ دانستہ یہ خطرہ اپنے سر لیتا ہے اور کئی مرتبہ افراد کے تصادم کو برقیاتی لہر کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے' جس کے اندر دونوں عناصر پیہم تخالف اور تعاون کے دائرے بناتے ہوئے آگے چلیں۔ میرے خیال میں جو آدمی ''مغل سرائے'' اور ''زمین جاگتی ہے'' کی طرح کے زوردار افسانے لکھ سکتا ہے اس کو ابہام برائے ابہام اور نمائشی مشکل پسندی کا طعنہ دینے کا کوئی جواز نہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ عصری صورت حال میں ان افسانوں کا لکھنا لازم تھا اور اگر ہم سوچ بچار کی صلاحیت سے بالکل بے نیاز نہیں ہو چکے تو ہمارے لئے ان کا پڑھنا اتنا ہی لازم ہے جتنا لکھنے والے کیلئے ان کا لکھنا۔

مظفر علی سید

8 محرم 1400ھ

ساخت و بافت کے اسلوب اور موتیف کی تلاش

(زمین جاگتی ہے، نقالوں کی رات، نیند میں چلنے والا لڑکا اور برجِ عقرب)

پہلے کہانیاں رات کو کہی جاتی تھیں۔ رات کو کہی جانے والی کہانیوں میں دنوں کی خیر منائی جاتی تھی اور سب کے دن پھر جاتے تھے۔ اب دن آسانی سے نہیں پھرتے، چٹان کی طرح سامنے کھڑے رہتے ہیں۔ اب کہانی لکھنے والے بھی رات کو کہی جانے والی کہانیاں نہیں لکھتے۔ اب دن کو کہی جانے والی کہانیاں لکھی جاتی ہیں کہ ہم سب دن کے عذاب میں مبتلا ہیں۔

اپنی آسانی کے لئے مرزا حامد بیگ کا شناختی نشان طے کر لیجئے۔ یہ علامتی افسانہ نگار ہیں۔ علامتی افسانوں میں وقت اور واقعات کی بنت میں وہ منطق نہیں ہوتی جو ہماری روزمرہ زندگی میں ہوتی ہے۔ جس سطح پر ہم وقت کی تفہیم کرتے ہیں اور جس نہج پر واقعات کا سلسلہ چلتا ہے، علامتی افسانوں میں یہ ساری سطحیں اور نہجیں مفقود ہوتی ہیں۔ لہٰذا علامتی افسانوں کو پڑھتے وقت ہمیں روزمرہ کی زندگی کی سطح کو چھوڑ کر وقت اور واقعات کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے نئی سطحیں اور نئے زاویہ ہائے نگاہ دریافت کرنے پڑتے ہیں۔

آپ اس کتاب میں شامل افسانوں کو پڑھ ڈالیں۔ میری طرح آپ کو بھی یہ محسوس ہوگا

گویا حقیقت اور خواب، معلوم و نامعلوم، موجود اور ناموجود سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

حامد بیگ ہمیں لبھانے کے لئے افسانہ شروع کرتے ہیں تو ان کے قدم ٹھوس زمین پر ہوتے ہیں۔ گردو پیش کی دنیا...... ٹھوس تفاصیل، ہمیں ہر شے مانوس معلوم ہوتی ہے۔ پھر کسی موڑ پر مانوس، غیر مانوس، میں اور ٹھوس اشیاء، تاثرات میں تحلیل ہو جاتی ہیں اور پورا افسانہ ایک علامت بن کر ذہن میں در آتا ہے اور ہم سے اپنے معنی اور جہتیں متعین کرنے کا تقاضہ کرتا ہے۔

مرزا حامد بیگ کے سارے افسانے میں نے پڑھ ڈالے ہیں۔ یہ کام میں نے قسط وار کیا ہے۔ ہر قسط پڑھنے کے بعد تھکن محسوس کی ہے۔ اس لئے کہ ان کہانیوں کے راستوں سے میری شناسائی نہیں تھی۔ میں نے حسب توفیق داستانیں بھی پڑھی ہیں، حقیقت پسند افسانوں سے آشنا ہوں اور بچپن میں پراسرار کہانیاں بھی پڑھ چکا ہوں۔ ان سب سے علیحدہ علیحدہ متعارف ہونے کے بعد مرزا صاحب کے افسانے دیکھے اور پڑھے تو میں چکرا گیا۔ یہاں یہ تینوں راستے ایک دوسرے میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ پوری ''بھول بھلیاں'' بن گئی۔ اور سیدھی راہ چلنے والوں سے یہ ''بھول بھلیاں'' ذہنی ریاضت طلب کرتی ہے۔

مرزا حامد بیگ کے ان افسانوں میں ایک پراسرار کیفیت قوی عنصر کی صورت میں ملتی ہے۔ پراسراریت کی ایک صورت تو ماضی کی ان نشانیوں میں ہے جو ہمارے قدیم تہذیبی ورثہ کی صورت میں اب بھی دیہی علاقوں میں کسی نہ کسی شکل میں باقی ہیں۔ کم از کم ان دیہاتوں میں تو ضرور ہیں جو آج کے بڑھتے پھیلتے ہوئے شہری ماحول سے دور ہیں۔ دوسرے وہ تفاصیل ہیں جن میں ہر شے کے ساتھ افسانہ نگار کوئی نہ کوئی جذبہ یا تاثر شامل کر دیتا ہے۔ تیسرے، افسانہ نگار کی یہ ٹیکنیک کہ ایک ہی وقت میں وقت کے دو دائرے ایک دوسرے کے متوازی گھومنے لگتے ہیں اور ہم بیچارے پڑھنے والے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں اور پھر دوسرے سے نکل کر پہلے میں چکر لگانے لگتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ

اکثر بظاہر معصوم اور سیدھے سادے عمل کے پردے میں زندگی کی منفی اقدار حرص، حسد، دشمنی، سازش کا وہ جال بنتی ہیں، جن میں پھنس کر انسانی نیکی بدی کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان افسانوں کے موضوعات اور ٹیکنیک دونوں، افسانوں کو پراسرار بنانے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن شاید یہ بات صحیح نہیں ہے۔

حامد بیگ کے افسانوں میں ٹیکنیک اور اسلوب خود موضوع ہے۔ وہ کسی موضوع پر افسانہ نہیں لکھتے۔ البتہ ان کے افسانوں میں موضوع ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ ان افسانوں کی ایک اور خصوصیت وقت کو مختلف صورتوں میں برتنے کی ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ زمانی حدود اور نقطوں کو ملانے والی منطق سے کام ہی نہیں لیتے۔ ماضی، حال اور مستقبل کا منطقی تصور وقت کے ساتھ ہمارا ذہنی تعلق قائم کر دیتا ہے اور اس حوالے سے ہم گردو پیش کی دنیا اور خود اپنی ذات سے ایک قابل فہم رابطہ قائم کر لیتے ہیں۔ حامد بیگ کے افسانوں میں یوں بھی ہوتا ہے کہ سب زمانے گڈ مڈ ہو جاتے ہیں۔ شاید یہ کہنا بھی درست نہیں، جب آپ ''سب زمانے'' کہتے ہیں تو بھی آپ کے ذہن میں زمانی حدود کا تصور ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ ہوتا ہے کہ وقت افقی اور عمودی دونوں صورتوں میں آگے پیچھے یا اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔ کردار ایک ہی وقت میں بوڑھے بھی ہوتے ہیں اور جوان بھی...... کبھی ماضی میں نظر آتے ہیں تو کبھی مستقبل کا سایہ بن جاتے ہیں۔ یہ زمانی جستیں بھی افسانوں کو پراسراریت کے ہالے میں لے لیتی ہیں۔

یہ چند باتیں وہ تھیں جو مرزا حامد بیگ کے افسانے پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں ابھریں۔ اصل میں پہلے کچھ تاثرات پیدا ہوئے اور یہ باتیں ان تاثرات کے تجزیے میں سامنے آئیں۔ اب میں ان کے چند افسانوں میں ساخت و بافت کے اسلوب اور افسانوں کے موتیف کی تلاش کرتا ہوں۔ میں یہ کام اس لئے کر رہا ہوں کہ ان نتائج کو پیش کر سکوں جو میں نے ان افسانوں کو اپنے طریق پر پڑھ کر حاصل کیے ہیں۔

افسانہ ''زمین جاگتی ہے'' ..... کی مرکزی حیثیت ایک اندھے کنویں کی ہے۔ پانی خشک ہو چکا ہے لیکن حرص و ہوس کی آلائش سے آلودہ کانوں کو پانی چلتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ پرانی کہانیوں میں کہا گیا ہے کہ آب حیات کسی تاریخی مقام پر ہے ..... لیکن اس کہانی کے چھ غیر مشخص اشخاص آب حیات کی تلاش نہیں کرتے۔ افسانہ نگار نے ان اشخاص کو کردار نہیں بنایا۔ یہ سائے کی طرح چلتے پھرتے بلا کردار کے انسان سونے کی تلاش میں کنویں پر پہنچے ہیں۔ دو پہلے آئے اور چار پیچھے آنے والوں کا انتظار کئے بغیر کنؤیں میں اترے۔ اترے اور مایا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ پھر پیچھے آنے والے چار پہنچے۔ ان چار میں سے دو لوٹ گئے کہ دو اور آدمیوں کو لائیں، اس لئے کہ ''جو چیز اوپر لانی ہے خاصی بھاری ہوگی۔'' اب دو، جو باقی رہ گئے ان کے بارے میں افسانہ نگار سے سنیئے :

''سن رہے ہو، کنویں میں سے چلتے پانی کی آواز آرہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں کنؤیں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں، اگر بہت جلد بھی پہنچیں تو صبح''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھے جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سانپ لہریئے لیتا ہے۔

یوں اس افسانے میں بات اندھے کنویں سے شروع ہوتی ہے اور منڈیر سے لگے ہوئے دو غیر مشخص اشخاص پر ختم ہو جاتی ہے، جن کی آنکھوں میں سانپ لہریئے لے رہا ہے۔ ''اندھے کنویں'' اور ''سانپ لہریئے'' والی آنکھوں کے درمیان حرص و ہوس کی پوری فضا ہے اور افسانہ نگار نے اپنی ٹیکنیک کے ذریعے یہ تاثر دیا ہے کہ آخری دو بھی کنویں میں اتر کر

مایا کی بھینٹ چڑھ جائیں گے تاہم یہ آخری نہیں ہوں گے کہ ابھی چار اور آئیں گے اور یوں یہ تسلسل قائم رہے گا۔

''نقالوں کی رات'' کی ابتدا بھی دیگر افسانوں کی طرح مانوس تفاصیل کے ساتھ ہوئی ہے۔ پھر اس کے دو کردار ''میں'' اور ''مسکینا'' ایک دوسرے سے وقت دریافت کرتے ہیں اور وقت کا تعین کرنے میں ایک دوسرے کو الجھا دیتے ہیں۔

''کہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا تو نہیں ہو رہا کہ باہر ہر طرف دوپہر ہو اور ہم سمجھ رہے ہوں کہ شام ہو گئی۔''

''یار ہم کتنی دیر کھیلتے رہے ہوں گے؟ جب تاش کھیل کر اٹھے ہیں' تب کیا وقت تھا؟ اور کیا سب دوستوں میں آج پھر جوتا چلا تھا؟''

''یار مجھے تو لگتا ہے جیسے یہ سب بیتے دنوں کی یاد ہے۔ کہیں ہم دونوں مغلوں کی اس چوکھٹ پر دم نہ دے جائیں۔''

اس کے بعد نوبت بجنے کی آوازیں...... نقالوں کے تماشے...... مرزے کے گاؤں اور ان کے ماضی کے کامے'' تاجے باجے'' والوں کی لاگ ڈانٹ...... شیرے کمہار کا اپنی بہن کے بدلے میں مرزوں کے گاؤں کی لڑکی کو گھوڑی پر بھگا لے جانا...... یہ تفاصیل بڑی خوبی سے پیش کی گئی ہیں۔

''پھانٹ دار کرتے پر سختی سے حمائل گورے بازوؤں والے گدرائے ہوئے وجود کو سنبھالے' شیرا ہوا ہو گیا تھا۔''

''ہم نے جرنیلی سڑک کی پلی کے نیچے ایک عمر گزار دی تھی۔ میں نے مسکینے کے سر پر چمکتے ہوئے چاندی بالوں کو چھوا۔''

''یار مسکینے ہم بھی بوڑھے ہو گئے۔''

وقت...... ماضی اور حال...... حال سے ماضی کی طرف سفر اور پھر حال میں پورے ماضی

کا احساس.......اسی ٹیکنیک سے پورا افسانے کی ساخت تیار کی گئی ہے۔

افسانہ ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' کے شروع ہی میں ہم اس کے مرکزی کردار سے متعارف ہو جاتے ہیں۔ پوری آبادی میں صرف ایک تھا جو سوتے میں بھی ہوا کے بین سن لیا کرتا تھا۔ اسے چاند سے ایک تعلق خاطر تھا۔ وہ اکثر راتوں میں آسمان پر رواں ستاروں کی چالیں شمار کرتا' وہ جاگتے میں سوتا رہتا اور سوتے میں جاگتا تھا۔'' گھر میں اس لڑکے کی شادی کا ماحول ہے۔ افسانہ نگار نے لڑکی والوں کے یہاں شادی کے ہنگامے کی جزئیات نہایت خوبی سے بتائی ہیں۔ بڑے مرزا صاحب' جن کی بیٹی کا نکاح ہے' لڑکیوں کے قہقہوں اور گیتوں کو پسند نہیں کرتے۔ ان کی ڈانٹ ڈپٹ پر اندرون خانہ بڑی بوڑھیوں کا غصہ اور اظہار ناراضی یہ سب خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ یکا یک دلہن سے سوال کیا۔'' نی.......میرے لئے وداع کا کوئی گیت نہیں گاؤ گی۔ وہ شیروں کی چھاتی والا نہیں آئے گا کیا؟''.......اور شیروں کی چھاتی والا نہیں آیا کہ وہ نیند میں چلتے چلتے کہیں اور نکل گیا تھا۔ نیچے تنگ گھاٹیوں میں گھپ اندھیرا گہرے سانس لے رہا تھا۔ ہریالی کے تخت پر وہ شیروں کی چھاتی والا اب تک اسی طرح سو رہا تھا۔

''نیند میں چلنے والا لڑکا'' جو جاگتے میں سوتا ہے اور سوتے میں جاگتا ہے اور جو اپنی شادی کے دن بھی اپنی دلہن کو گھر لانے کے بجائے نیچے گھاٹیوں کی ہریالی کے تخت پر سویا ہوا ہے' آخر ہم سے کس طرح متعلق ہے؟ کس رجحان کا نمائندہ ہے؟ کس رویے کی نشاندہی کرتا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کردار عام معاشرتی زندگی کے آہنگ میں شامل نہیں ہے۔ معاشرے کے خلاف شعوری احتجاج کی ہمت بھی نہیں رکھتا لہذا اس کام کو اس کا لاشعور سر انجام دیتا ہے۔ تاہم لاشعور کے احتجاج کا دوسرا نام ''فرار'' ہے۔ فراری ذہنیت والا یہ لڑکا' جو گردو پیش کی معاشرتی زندگی سے لاتعلق ہے اور معاشرے کے خلاف جس کا احتجاج لاشعوری ہے' بالآخر فطرت کی گود میں پناہ لیتا ہے۔ نفسیات داں فطرت کو ''آغوش مادر'' کی علامت بتاتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ افسانے کا مرکزی کردار ابھی بالغ بھی نہیں ہوا ہے۔ بلوغت تو معاشرے کے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگی اور اپنی معاشرتی شخصیت کی شناخت سے پیدا ہوتی ہے۔شادی کرنا محض جنسی ضرورت کو پورا کرنا نہیں ہے۔ یہ دراصل معاشرے کے چیلنج کو قبول کرنا ہے۔ نابالغ کی آخری پناہ گاہ ماں کی گود ہے فطرت اسی گود کی علامت ہے۔ جہاں بقول افسانہ نگار ''شیروں کی چھاتی والا'' سو رہا تھا۔ یہاں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ لاتعلقی (Alienation) کا حامل شخص ایک شکستہ اور پرآشوب معاشرتی نظام میں اپنی ذات کی شناخت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ صحیح ہے۔ تاہم لاتعلقی کی وہ صورت جہاں کوئی شخص اپنی شخصیت کے تحفظ کے لئے ٹوٹتے بکھرتے معاشرتی نظام کو چیلنج کرتا ہے' اس صورت سے مختلف ہوتی ہے۔ بہرحال اگر آپ چاہیں تو اسے بھی ''احتجاج'' کی ایک صورت کہہ لیں۔

اب تک میں نے مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں سے تین افسانوں کے بارے میں اپنے مطالعے کے نتائج پیش کئے ہیں۔ شاید نتائج کہنا صحیح نہیں ہے۔ میں نے تو محض چند اشارے اس سمت کئے ہیں جس سے گزر کر آپ افسانے کی فضا میں داخل ہو سکتے ہیں۔ میں نے بھی محض اس فضا سے چند تاثرات اخذ کئے' ہوسکتا ہے کہ قارئین مجھ سے زیادہ تاثرات اخذ کریں اس لئے میں مزید کچھ نہیں کہتا۔ ان افسانوں کے بارے میں اپنے تاثرات دوسروں پر ٹھونسنا' افسانوں پر ظلم ہوگا۔ میں ایک افسانے کا اور ذکر کروں گا' وہ افسانہ ہے ''بُرجِ عقرب''۔ اس افسانے کے کردار انسان اور بچھو ہیں۔ ایک شخص ایک لکڑی کے چھوٹے سے بکس میں ایک زندہ بچھو جوہریوں کی دکان پر لاتا ہے اور سونے کے بکس اور سونے کا بچھو بنانے کی فرمائش کرتا ہے۔ دکان کے مالک دو اشخاص یہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ پہلا شخص ایک مقررہ وقت پر آتا ہے اور سونے کے بکس میں سے سونے کا نر بچھو لے جاتا ہے۔ گویا کسی طلسماتی عمل کے زیراثر سونے کا ''بچھو'' اپنے ہی جیسے ایک نئے بچھو کو جنم دیتا ہے۔ جب وہ شخص اس ''بچھو'' کو لے جاتا ہے تو اس کی جگہ اسی قسم کا دوسرا بچھو پیدا ہو جاتا

ہے۔ بچھو بنانے والے اس طلسماتی عمل کو دیکھ کر خود لالچ میں مبتلا ہوتے ہیں۔ کچھ مدت بعد وہ دکان فروخت کر دیتے ہیں اور اس بکس کو چھپا کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ مسلسل سات دن اور سات رات اپنے حصے کے بچھو کے لیے بے چین رہنے کے بعد بھی انہیں کچھ نہیں ملتا تو وہ اصل مالک کی تلاش میں نکلتے ہیں۔ اس کے گھر پہنچ کر ایک زمین دوز کمرے میں بدبو اور سڑاند کی فضا میں انہیں یہ پتا چلتا ہے کہ اصل مالک نے خودکشی کر لی ہے۔ انہیں یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ زندہ بچھو انہیں تلاش کر رہا ہے۔ اس افسانے میں فوق الفطرت عنصر کی سنسنی خیزی اور اس کے ساتھ شیطنت اور بدی کی بیمار فضا عجیب طور پر گندھی ہوئی ہے۔ انسان اپنے منصب سے گر کر ''سونے کے بچھو'' کی تلاش میں ایک ایسے بنجر عمل میں مبتلا ہو جاتا ہے بالآخر موت اسے جکڑ لیتی ہے۔ سونے کی تلاش میں انسان اپنا رابطہ انسان کی بجائے بچھو سے قائم کرتا ہے۔ موت اس کی منتظر ہوتی ہے اور وہ اس کا شکار۔ دکان کے مالک دو اشخاص جو ''بچھو'' کی حرص میں مبتلا ہوتے ہیں لیکن اسے پانے میں ناکام رہتے ہیں، وہ بھی انسانوں سے اور انسان کے تخلیقی عمل سے رابطہ منقطع کر لیتے ہیں۔ پہلے شخص کا تعارف کراتے ہوئے افسانہ نگار ہمیں بتاتا ہے:

وہ کہتا ہے۔ ''آپ اجازت دیں تو میں قے کر لوں۔''

''...........................''

''یہ میری مجبوری ہے۔''

وہ اطمینان سے رکھے ہوئے شوکیس پر دونوں کہنیاں ٹکا کر گردن جھکا لیتا ہے۔ سرخ قیمتی قالین پر قے کرتا ہے۔ جگ مگ کرتے زیورات کا شیشہ قے کے چھینٹے پڑنے سے دھندلا جاتا ہے۔''

دوسرے دو اشخاص جو دکان بیچنے کے بعد سونے کا بکس اپنے ساتھ لے آئے ہیں، نئے بچھو کی پیدائش کے منتظر ہیں، سکون کو کھو کر اپنے لیے سازش اور بے سکونی کی فضا تیار کرتے

ہیں۔

''یہ رات میں نے جاگ کر گزاری ہے۔

مجھے اپنے ساتھی پر شک ہے بلکہ پورا یقین ہے کہ......

اس لئے احتیاطاً میری پتلون کی جیب میں ریوالور ہے۔ مجھے کچھ پتہ نہیں وہ میرے متعلق کیا سوچتا ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے رات جاگ کر گزاری ہے۔ ہر لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری نگرانی کرتا رہا ہے۔

اب ہم دونوں کے درمیان میز پر بکس رکھا ہے۔''

بدی' بیماری' سازش اور سنسنی کی اس فضا میں' افسانہ نگار نے نہایت خوبصورتی اور مہارت سے' حرص کے جذبے کے تحت انسان اور بچھو کو مربوط کیا ہے۔ بدی اور گناہ کی یہ فضا' جمالیات اور اخلاقیات دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔ افسانہ کی ساخت میں اشیا کو ایک دوسرے کے متوازی دکھا کر' حسن و اخلاق کی تباہی کو واضح کیا گیا ہے۔ ایک طرف پہلا شخص ہے جسے دیکھ کر ہی غلاظت کا احساس ابھرتا ہے' اس احساس کو قے کرنے کے عمل سے اور تقویت ملتی ہے۔ دوسری طرف دوکان کے مالک ہیں جن میں سے ایک دکان کو اندر سے بند کر لیتا ہے۔ خوبصورت قالین پر پڑی ہوئی گندگی کو گدّی کاغذ سے چھپا دیتا ہے اور اس بات کا خیال کرتا ہے کہ بدبو باہر نہ جانے پائے۔ ایک طرف یہ خوبصورت دکان اور اس کا خوبصورت ماحول ہے' دوسری طرف پہلے شخص کی رہائش گاہ ہے' جس میں بدبو اور تعفن کے باعث سانس گھٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور انجام کار زندگی کا تخلیقی عمل رک جاتا ہے اور موت کے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔

آخر میں' میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ ان افسانوں کا مطالعہ افسانوی ادب کی نئی جہتوں کی پیمائش ہے۔ اردو میں جو نئے افسانے لکھے گئے ہیں اور جن میں نئے اسالیب برتے

گئے ہیں وہ یا تو علامتی ہیں یا تجریدی۔ علامتی افسانوں میں بالعموم ساخت کا خیال رکھا گیا ہے اور تجریدی افسانوں میں معنی کی فضا کا۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے زیادہ تر علامتی ہیں جب کہ کئی افسانوں میں مثلاً ''دھوپ کا چہرہ'' پر تجریدی عنصر حاوی نظر آتا ہے۔

جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے، اس سلسلے میں مرزا حامد بیگ آزادی سے کام لیتے ہیں۔ حقیقت کا ماحول اور یقین کی فضا پیدا کرنے کے لئے شاید ایسا ضروری بھی ہے کہ اکثر مقامی الفاظ یا الفاظ کا مقامی تلفظ ہی استعمال کیا جائے۔ تاہم کہیں کہیں مجھے بے احتیاطی کا شک بھی گزرا ہے مگر شک کا فائدہ حامد بیگ کو ہی ملنا چاہئے۔ اس لئے کہ شک کا فائدہ ملزم ہی کو ملتا ہے۔

سجاد باقر رضوی
یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

تین افسانے

(گمشدہ کلمات' نیند میں چلنے والا لڑکا' مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا)

یہ افسانے مربوط پلاٹ' جملوں کے جڑاؤ اور وقت کے تسلسل سے عبارت ہیں۔ ان افسانوں میں قدیم طریق کار جزوی حیثیت سے اپنایا گیا ہے۔ زمانی طور پر نہ کوئی الٹ پھیر ہے نہ ٹوٹ پھوٹ' مکانی طور پر بھی ہر چیز اپنی مناسب جگہ پر رکھی گئی ہے۔ اشیاء میں نہ کہیں ترچھا پن ہے اور نہ غیر متوازن تجسیم نظر آتی ہے۔ ماحول کا واضح بیان' گردو پیش کی عکاسی میں جزئیات کی تفصیل اور باریک سے باریک مشاہدہ ان افسانوں کی خصوصیت ہے۔ تینوں افسانوں کے عنوان بھی نفس افسانہ کی نمائندگی کرنے کے علاوہ کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔

پھر کیا چیز ہے جو ان افسانوں کو روایتی طرز سے مختلف کرتی ہے؟

پہلی چیز افسانے کا گٹھاؤ ہے جو ایک طرف غیر ضروری تفصیلات سے گریز کے باعث پیدا ہوتا ہے مگر دوسری طرف ضروری تفصیلات کا اضافہ بھی اس گٹھاؤ کو بڑھاتا ہے۔ افسانہ ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' کی مثال لیجئے۔ جہاں دلہن کے گھر کی چہل پہل' بارات کی آمد سے متعلق تیاریوں اور ماحول کی تفصیلات کو پیش کرنا نہایت ضروری ہے۔ مگر فنکار کا ٹریٹ منٹ افسانے کے گٹھاؤ کو بڑھانے کا کام کرتا ہے۔ دوسری طرف نیند میں چلنے والے لڑکے کا داخلی آہنگ اپنی شدّت واضح نہ کرتا' اگر بارات کے ہنگامے سے متعلق تفصیلات گھٹا دی جاتیں۔

افسانہ ''گم شدہ کلمات'' میں مرزا مغل بہادر کی حویلی کا تفصیلی مشاہدہ اور فیکے کاکا کے فطری ماحول کا ایک ایک جزو بیان بھی افسانے کے گٹھاؤ والے عمل کو مہمیز دیتا ہے۔ ورنہ ان دونوں کیفیتوں کا تصادم نہ اس قدر شدّت اختیار کرتا اور نہ اتنی پیچیدہ صورت حال کا مظہر ہوتا۔ افسانہ ''مشکی گھوڑوں کی بگھی کا پھیرا'' میں ساری تفصیلات واقعہ کی سطح پر ہیں۔ تاثر کی اکائی قائم کرنے کے لئے امیجز پاس پاس سمٹتی ہیں۔

افسانے کا گٹھاؤ کئی باتوں کو اکثر ایک ساتھ اور ایک ہی جملہ میں ادا کرنے کی وجہ سے بھی ہے۔ یہ طرز نئے فنکاروں کا ہے جو مروجہ اسلوب سے گریز کرتے ہوئے عموماً ایک جملہ میں ایک ہی بات کہنے کا پرانا رویہ اختیار نہیں کرتے بلکہ ہر جملہ کے بعد دیگرے کئی امیجز کو یا ماحول کے کئی عناصر کو لے کر آگے بڑھتا ہے۔ یہ نیا طریق کار اپنے قاری سے کچھ مخصوص اور محتاط رفتار کا مطالبہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ جیسے جیسے آگے بڑھے ایک ایک کیفیت کو ذہن نشین کرتا ہوا چلے۔ ہر امیج یا استعارہ چاہے وہ آغاز میں ہو' درمیان میں یا آخر میں' اپنے ربط کی اہمیت رکھتا ہے اور پڑھنے والا اگر کسی کیفیت سے سرسری گزرتا ہے یا اسے فراموش کرتا ہے تو افسانہ کا دوبارہ پڑھا جانا لازمی ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے جملے جن میں کئی امیجز یا کیفیت جاگتی چلی جاتی ہیں کم سے کم بیانیہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو بیانیہ کی زائد شمولیت سے جملے غیر ضروری حد تک طویل ہو جائیں اور ان کی ڈور پڑھنے والے کی گرفت سے چھوٹ چھوٹ جائے۔ جملوں کے سینٹکس کی چند مثالیں......

''مشعلوں کی اڈتی ہوئی زردی میں مغلوں کا گھوڑ دوڑ میدان خاموش تھا اور رنگی ہوئی ہوا قافلے کے ساتھ دبے پاؤں چلی آئی تھی......''

''فیکے کاکا کے استقبال کی خاطر' مرزا بہادر' حویلی کے بڑے دروازے تک خود چل کر آئے۔ تمام نگاہیں ان کے پاؤں کی کامدار جوتیوں سے اوپر نہ اٹھتی تھیں اور اوپر لش لش کرتی بھاری چادر کا گھیر تھا۔''

''گمشدہ کلمات'' سے اقتباس

''سامنے بہت بڑے ہجوم کے درمیان چمکتی سنگینوں کے کڑے پہرے میں ڈھیرے ڈھیرے سیاہ پردوں سے پوری طرح ڈھکا' سلاخوں سے بنا پنجرہ دھکیلتے ہوئے لایا جارہا تھا اور لوگ بڑے سرکاری اہلکاروں کی موجودگی میں کارندوں کے کاندھوں پر ہڈیوں کے انسانی پنجر کو احتیاط کے ساتھ گلیر سے نیچے اترتے دیکھ رہے تھے۔''

''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'' سے اقتباس

''وہ ڈھیلے کانوں میں بالیوں کو جھلاتی' کولہو پر دونوں ہاتھ ٹکائے' لڑکیوں کو سمجھاتی بجھاتی' بڑے مرزا سمیت پوری برادری کو صلواتیں سناتی' گھڑی بھر میں ہانپ کر بیٹھ گئیں......''

''نیند میں چلنے والا لڑکا'' سے اقتباس

فنکار کا نیا اسلوب ایک طرف تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے تو دوسری طرف داخل اور خارج کو اکثر بیک وقت ساتھ لے کر اس طرح چلتا ہے کہ نہ داخل کا ربط ٹوٹے نہ خارج کی شکل بگڑے اور دونوں اپنی اپنی جگہ ایک ساتھ نظر آئیں......

مثلاً

''میں شاید آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ پوہ ماگھ کی طویل رات تھی' کھڑکی کے پٹ اسی طرح وا تھے اور وہ زردی میں نہائی بے سدھ تھی۔ میں نے اس ہڈیوں کے پنجر کو وہاں اتارا ہے اور باہر آ گیا ہوں۔''

''ہاتھی متعدی ہوتے ہیں بیٹا......''

''وہ جاگتے میں سوتا اور سوتے میں جاگتا تھا...... وہ ڈھیرے ڈھیرے اٹھا' جیسے سب جاگتے میں اٹھتے ہیں۔ اس نے جھک کر کھیڑیاں پہنیں اور دروازہ کھول کر صحن میں نکل آیا۔ اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑی بکائن میں سے زرد زرد چاند اسے جھانک رہا تھا۔''

مرزا حامد بیگ کی ایک خصوصیت ہے ماحول کی سنگینی' گراں باری اور مصنوعی پن کو قدرتی مناظر کی کشش' فطرت اور ازلی کیفیات سے ٹکرا دینا۔ وہ ماحول اور مناظر کو پیچ در پیچ بنتے ہیں۔

افسانہ ''گمشدہ کلمات'' کا پہلا جملہ ہی ہمیں افسانے میں ہونے والے واقعے یا حادثے کے لئے تیار کر دیتا ہے۔ شفاف آسمان پر بادلوں کے رنگین بجروں کا نظر آنا کسی ایسے حادثہ کی طرف اشارہ کرتا ہے جو رونما ہونے والا ہو۔ اس سلسلے میں خوفزدگی کے بجائے جذباتی رنگت ہوسکتی ہے۔ اس لئے کہ آگے دریا کا ذکر آیا ہے' جس میں پرسکون انداز کارفرما ہے۔ عصر کا وقت ایک مخصوص اشارہ بن گیا ہے جو ایک طرف بیتنے (جھیلنے اور وقت گزارنے کا احساس) تو دوسری طرف جھکنے کا نشان ہے۔ سارے افسانے میں ہم دیکھیں گے کہ بیتنے اور جھکنے کا عمل اپنے مفہوم کے تنوع کے ساتھ جا بجا نظر آتا ہے۔ جھکاؤ کے سلسلے میں افسانے کے چند اشارے قابل توجہ ہیں۔

نشیب میں گرتی ہوئی پگڈنڈیاں' بابا کی ڈوبتی ابھرتی آواز' فیکا جس کی پہچان اس کے باپ کے حوالے سے نہیں ماں کے حوالوں سے تھی' آج مرزا بہادر نے فیکے کو عزت بخشی تھی' وہ کھاٹ پر بیٹھا سامنے کو آدھا جھکا ہوا کھانس رہا تھا' شمالی کنارہ دریا کے کٹاؤ میں بیٹھ گیا تھا' تمام نگاہیں ان کے پاؤں کی کامدار جوتیوں سے اوپر نہ اٹھتی تھیں' دشمن زیر' آپ بہادر نے کاکا کو لپک کر اپنے ساتھ مسند پر گھسیٹ لیا۔ وغیرہ۔

افسانے کا سارا تانا بانا مرزا بہادر کی زوال آمادہ تازہ کیفیت کے ارد گرد گھومتا ہے۔ پھر فیکے کاکا کے انکشاف سے زوال کے گھوڑے کو مہمیز لگتی ہے۔ بیتنے (جھیلنے) کی کیفیت مرزا بہادر کی جانب سے فیکے کاکا کو عزت بخشنے کے عمل میں نظر آتی ہے تاکہ ان کی فرسودہ جاہ و حشمت کی نہ صرف توثیق و تصدیق ہو جائے بلکہ وہ رعیت پر اپنی حاکیت کا رنگ چڑھا سکیں۔ زوال کے لپکتے ہوئے پنجوں پر قابو پانے کی یہ صورت ایک آخری کوشش کے مترادف ہے۔

مرزا بہادر پر کٹھن وقت آ پڑا ہے اور اب فیکے کا کا ہی ان کے لئے امید کی کرن ہے۔ دوسری طرف بیت جانے کا عمل فیکا کا کا کی نچلی سطح پر بھی کارفرما ہے۔ افسانہ دونوں سطحوں کو ٹکرا کر ایک ایسی سچویشن سامنے لاتا ہے جہاں رعیت کے سامنے ایک مسئلہ کھڑا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ہمدردی اور احترام کا جذبہ مرزا مغل بہادر کے حضور میں پیش کرے یا فیکے کا کا کو نوازے۔ افسانے کی خوبی یہ ہے کہ اس نے فطری زندگی اور فطرت کی آزادی کو تقویت پہنچائی ہے۔ فیکا کا کا زیادہ مضبوط نظر آتا ہے اس لیے کہ وہ قدرتی مناظر کی آغوش میں پلا ہے۔ مرزا بہادر کا زوال خوردہ نظام فطرت کے آہنگ سے پرے ہو جانے کے باعث اپنے انجام کو آ پہنچا ہے۔

یہاں قاضی عبدالستار کے افسانوں سے موازنہ بیجا نہ ہوگا' جن کے یہاں جاگیردارانہ نظام کے مضبوط پہلو کی عکاسی ہوئی ہے۔ یعنی جاگیردار اپنے ضبط و تحمل کی فطرت ثانیہ کی بنا پر ٹوٹ سکتا ہے' جھک نہیں سکتا۔ مرزا حامد بیگ کے یہاں جاگیردار سے ردعمل تو باقی ہے مگر ہم جاگیردار کی فطرت ثانیہ کو جھکتا ہوا پاتے ہیں۔ کیا افسانے میں فیکا کا کا کی طرف زیادہ جھکنے کا عمل نہیں ہے۔ ہر عمل اپنی طاقت میں ردعمل کے برابر ہوتا ہے۔ یہ ایک پیراڈاکسی ہے۔ یہ افسانہ فیکا کا کا کی طرف جھکتا ہے تو یہ متوازن رویہ ہے یا نہیں۔

افسانہ ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'' شہر کے ماحول کا احاطہ کرنے کے باعث زیر نظر باقی دونوں افسانوں سے مختلف ہے' جن میں بستی نظر آتی ہے۔ عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ افسانہ ایک دائروی محور رکھتا ہے۔ مگر یہ محور یکے بعد دیگرے منظر میں آنے والا وہ پنجر ہے جو چورستہ پر لٹکائے گئے باغی چور کا ہے' یا وہ ہجوم ہے جو چوک میں لان کے چاروں طرف باغی چور کی سزا کو تجسس بھری نظروں سے دیکھنے کے لیے جمع ہے' یا مشکی گھوڑوں والی بگھی ہے جس میں کھڑے کالروں والا' احکام صادر کرتا ہے اور جس کے احکام پر کارندوں کی سخت کارروائی چلتی ہے' یا وہ بچہ ہے جو تابوت کے ڈھکنے پر بیٹھا ہے اور جو بعد میں تابوت کے جلوس کے پیچھے

پیچھے چلتا ہے یا وہ راوی ہے جو استعجاب کے عالم میں سوالات کرتا ہے اور جھڑک دیا جاتا ہے یا وہ ماں ہے جو پیتل کی گڑوی میں گڑ لائی ہے اور راوی کے ساتھ ساری رات اسی جگہ بیٹھ کر گزار دیتی ہے جہاں گلیر پر لیر لیر کرتے کی پھڑ پھڑاہٹ کے ساتھ باغی چور کی لاش لٹکی ہے یا وہ ہاتھی ہے جسے ماں پہچانتی ہے کہ متعدی ہوتا ہے اور سونے میں اسے گھڑنے کے احکام پر مجبور ہونے والا آخرکار باغی چور قرار دیا جاتا ہے یا وہ ریشم کا کیڑا ہے جو گڑ کے خمیر اٹھنے اور نیچے بہنے کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ریشم بنتا ہے تاکہ باغی بیٹے کی نجات کی موہوم سی راہ نکل آئے۔ کہنے کا مطلب ہے کہ افسانہ کا گٹھاؤ اپنے استعاروں کے تانوں بانوں کی مضبوطی پر قائم ہے اور یہ پہچاننا کٹھن ہے کہ کس استعارے پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔

میں اپنے طور دو استعاروں کو منتخب کر سکتا ہوں۔ مثلاً سونے کا ہاتھی اور ریشم کی ڈور اور انہیں کلیدی کہہ سکتا ہوں۔ ہاتھی کا متعدی ہونا اور سونے کا ہاتھی گھڑنا ایک قدرتی مظہر کو زبردست مقصدیت کے سانچے میں ڈھالنے کے مترادف ہے۔ نتیجہ بہرحال اس کے لیے خطرناک ہو سکتا ہے جو مجبور ہو کر سونے کا ہاتھی بنانے کے عمل میں منہمک ہو جاتا ہے۔ سونے کا ہاتھی چھین لینے کے لیے تنظیم الزام عائد کرتی ہے اور اسے مجمع کے سامنے اپنی بے گناہی (تابوت کے ڈھکنے پر بیٹھے ہوئے بچے کی امیج) کے باوجود باغی چور کی سزا دی جاتی ہے۔

''بیٹا ہاتھی متعدی ہوتے ہیں لیکن یہ سب نہیں جانتے' انہوں نے جس کسی کو بھی سونے کا ہاتھی تعمیر کرنے کو کہا وہ باغی چور ثابت ہوا اور تم نے دیکھ لیا کہ باغی چور کی سزا......''

ایک ہی مدار میں گردش کرنے والا عمل جو بار بار اپنے آپ کو دہراتا ہے یعنی سونے کا ہاتھی تیار کرنا اور نتیجہ میں گلیر پر باغی چور کے انجام کو پہنچنا' اسے توڑنے اور نیا مدار تخلیق کرنے کا عمل پیتل کی گڑوی میں بند ہے۔ جس میں گڑ ہے۔ گڑ کس طرف اشارہ کرتا ہے۔؟ فطرت کی طرف......؟ عوام کی طرف......؟ یا گانو' مٹی یا کھیتوں وغیرہ کی طرف......؟ یہ گڑ...... ہوا' بارش' تمازت وغیرہ کے اثرات یعنی فطرت کے عمل سے خمیر ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ ہے ریشم کا

کیڑا پیدا ہونا۔ ریشم کا کیڑا قلب ماہیت کی نشاندہی کرتا ہے جو باغی بیٹے کو فرسودہ مدار سے آزادی دلانے کی موہوم کوشش ہے۔ ریشم کا پیدا ہونا اور اس کی ڈور کے سہارے باغی بیٹے کا گلیر سے نیچے اتر آنا۔ ایک محدود اور سنگین صورت حال کی بار بار تکرار سے نکل کر لامحدود فطرت کی جانب بڑھنے کا عمل۔

افسانہ ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' جن سطحوں پر رواں ہے وہ خصوصاً فرد اور افراد کی طبیعت یا مزاج کو ابھارتی ہے۔ یہ سطحیں داخلیت کی زیریں رو کو تہ دست رکھتے ہوئے خارجی طور پر عادات و اطوار کی شدت اور رسم و رواج کی روایت کے تانے بانے بنتی ہیں۔ شادی کے ہنگاموں کی سطح کینوس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس سطح پر عمل اور ردعمل کی اٹھتی گرتی لہریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ شادی کے ہنگامے ایک طرف شادمانی کے فراز چڑھتے ہیں تو دوسری طرف بڑے مرزا کے ردعمل سے مایوسی اور غم انگیزی کے نشیب میں اتر جاتے ہیں۔ یہ پس منظری سطح ہوئی۔ البتہ جو دو سطحیں خاص طور پر اوپر اٹھتی ہیں' ان میں ایک بڑے مرزا کی رنگین مزاجی کا الٹا رخ ہے' (مغلوں کی عزتیں گھروں سے باہر قدم نہیں دھرتیں)' جو ایسے موقع پر ٹیڑھا اور اکڑ سے واضح ہے۔ اس لیے کہ ان کا عقابی مزاج آخر کار حاوی ہو جاتا ہے۔ (مرزے کا حکم ہے' جس طرح باز جھپٹتا ہے نا بس اسی طرح جھپٹ پڑو) اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ نوبت دولہا کو قتل کرنے کی سازش تک جا پہنچتی ہے۔ افسانے کو اس بات سے غرض نہیں کہ یہ سازش تکمیل کو پہنچتی ہے یا نہیں' البتہ یہ ضرور ہے کہ وہ ایسے نظام کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے جو اپنی تنظیم کی تمام تر قوت کو عہد حاضر کے ساتھ برقرار رکھنے کا اہل نہ ہو' اس کی تازگی' نفس پرستی کا شکار ہو' اور پیچ و تاب میں پھنس کر جبر کی تخلیق کرنا جس کا مقدر ہو۔ نیند میں چلنے والا لڑکا بھی ایک الگ مگر متوازی سطح قائم کرتا ہے۔ یہ دوسری سطح ہے۔ لڑکا شادی کے رواج کی بندشوں کو جاگتے ہوئے یا شعوری طور پر تو قبول کرتا ہے مگر نیند کی گرفت ایک انوکھی مگر فطری قوت بن کر اسے ایک علیحدہ راہ دکھاتی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فرد سے اس کا جبر یہ ماحول سماجی سطح پر جس

قوت ارادی کا تقاضا کرتا ہے' اس سے نجات کی غیر شعوری تکمیل ہوتی ہے۔ یعنی فرد اپنے آپ کو فطری مناظر یا اس کے آہنگ کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ لہریں ایک طرف تو اسے خود بہ خود دلہن کی جانب رواں کر دیتی ہیں اور دوسری طرف شاید بڑے مرزا کے شکنجے سے بچاؤ کا ذریعہ بھی بن جاتی ہیں۔ افسانہ ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' طنز ملیح (Irony) کی ایک شکل ہے (''مغل سرائے۔'' سونے کی مہر' میں بھی کچھ یہی صورت حال ہے) یعنی یہاں لڑکی اور لڑکا دونوں ہی ماحول کے جبر سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ان کی فطری راہیں' ان کے خواب' اچانک ماحول کے جبر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ لڑکی شادی کی گھٹن والی فضا سے نکل کر سہیلیوں سمیت بالکنی پر آ جاتی ہے اور لڑکے کو نشیب میں سوتا ہوا پاتی ہے۔ فنکار نے یہاں واضح نہیں کیا ہے کہ وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ پہچانتی ہے یا نہیں (ظاہر ہے کہ راوی خود کہیں نظر نہیں آتا۔ افسانہ خارجی امیجز کو پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ افسانے کی داخلیت کی روقاری کے ذہن کا حصہ ہے۔) مگر سوال اٹھتا ہے کہ کیا وہ اتفاقی طور پر لڑکے کو ایک کنج میں سوتا ہوا دیکھتی ہے' یا اس کی کوئی انجانی مگر بیدار حس کام کرتی ہے جو شادی کے رسم و رواج سے ماورا ہے' اغلب ہے کہ لڑکے ہی کی طرح دلہن کا داخلی آہنگ بھی قدرتی مناظر کے ماحول سے میل کھاتا ہے۔ مگر جبر اس پر بھی حاوی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس افسانے کی خصوصیت کیا ہے۔ بڑے مرزا کا مزاج' شادی کے ہنگامے اور بے کیفیاں کوئی نئی بات نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بڑے مرزا کی فطرت کھل کر سامنے آئی ہے۔ مگر یہ افسانے کی تازگی کا باعث نہیں ہے۔ اس سے کوئی نیا اشارہ کوئی نئی کیفیت جو عصر حاضر کی نشاندہی کرے نہیں ملتی۔ ظاہر ہے صرف لڑکے کی نیند میں چلنے والی کیفیت ہی ایک منفرد حیثیت اختیار کرتی ہے اور سارے ہنگامے' سارے پس منظر کو زندہ کر دیتی ہے۔ یہ کیفیت کل کے ایک ایک جزو میں سرایت ہو جاتی ہے۔ لڑکے کا نیند میں چلنا' اس پر داخلیت کا اس درجہ حاوی ہونا ہے کہ نئی صورت حال کے امکانات نظر آنے لگیں' یہ عمل قلب

ماہیت کا عمل ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرسودہ نظام کے ماحول سے گریز کا ایک راستہ' اضطراری اور غیر شعوری مگر فطری طور پر اپنے آپ کھل جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نیند میں چلنے کا عمل ایک علامتی اشارہ ہے' ایک فنامنا ہے' پچویشن نہیں۔

مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں ہمیں بارہا تازہ علامتی اشارہ ملتا ہے۔ ''مشکی گھوڑوں والی بگھی کا پھیرا'' میں ریشم کے کیڑے کی راہ سے تقلب کی راہ کی پہچان کرائی گئی۔ 'گمشدہ کلمات' میں فیکا کا کا خود ایک فنامنا ہے' جو کھیتوں کے بیچ سے درخت کی مانند اگ کر مرزا مغل بہادر کی حویلی کی بنیادیں ہلانے کا کام کرتا ہے۔ 'برج عقرب' میں نجوم کے اثرات سے پیدا شدہ وقتی پراسراریت اور مقناطیسیت سے ایک نئی صورت حال خلق ہوتی ہے۔ چنانچہ فرد کا شہری کردار' زندگی پر اس کی قلیل مدتی گرفت' عمر کے کارآمد وقفے کی ناپائیداری' ماحول کی زہرناک کیفیت' یہ ساری باتیں اظہار میں سمانا چاہتی ہیں اور بچھو کی مرکزی علامت جھانکنے لگتی ہے۔ بچھو سے بچھو کا پیدا ہونا اور اس کے لئے مخصوص ساعت اور وقت کا مقرر ہونا کسی فنامنا کی طرف اشارہ ہے۔ اس طرح کے فنامنا نئے افسانے کی تازگی کا سرچشمہ ہیں اور روایتی افسانوں کے انجماد کو توڑنے کا کام کرتے ہیں۔ افسانہ ''سونے کی مہر'' جبر و استحصال کے درمیان ابھرتا ہے' جس میں فطری اور طبعی زندگی پر ڈاکہ زنی ہوتی ہے۔ اس کا تقابل افسانہ ''نیند میں چلنے والا لڑکا'' سے کیا جا سکتا ہے' اس لیے کہ دونوں محرکات ایک جیسے ہیں۔ افسانہ ''سرسوتی اور راج ہنس'' اسطوری کردار پر مبنی ہے۔ اس میں راج ہنس کا عمل اور اس کا انجام افسانے کو Crisis کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے۔ بہت ہلکی روشنی اور لشکتی ہوئی شے ایک علامتی اشارہ ہے۔ راج ہنس کا سرسوتی کے ہاتھوں پر جان دینا Ironic Situation کی عکاسی کرتا ہے۔ افسانہ 'مغل سرائے' میں پہلے ماحول کو بڑھاوا (Elevation) دیا جاتا ہے' پھر اسے منتشر (Deflate) کر دیا جاتا ہے اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب نقلی اور بناوٹی صورت حال اپنی اصلی شکل سے ٹکراتی ہے۔ افسانہ کے آخر میں اچانک حقیقت کے بھیانک

پن کا ٹریٹ منٹ ہے۔ ساری باتوں میں ایک بات یہ بھی ہے کہ مرزا حامد بیگ زبان کا تخلیقی استعمال کرتے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کے جتنے افسانے میری نظر سے گزرے ہیں ان میں منظر نگاری، امیج سازی، اسطوری بنت اور علامتی تشکیل کی راہیں اختیار کی گئی ہیں مگر فنتاسی کا ٹریٹ منٹ نظر نہیں آیا۔ ظاہر ہے وہ حقیقت کی زمین پکڑ کر چلتے ہیں۔

مہدی جعفر
شاستری نگر...... بھوپال (بھارت)
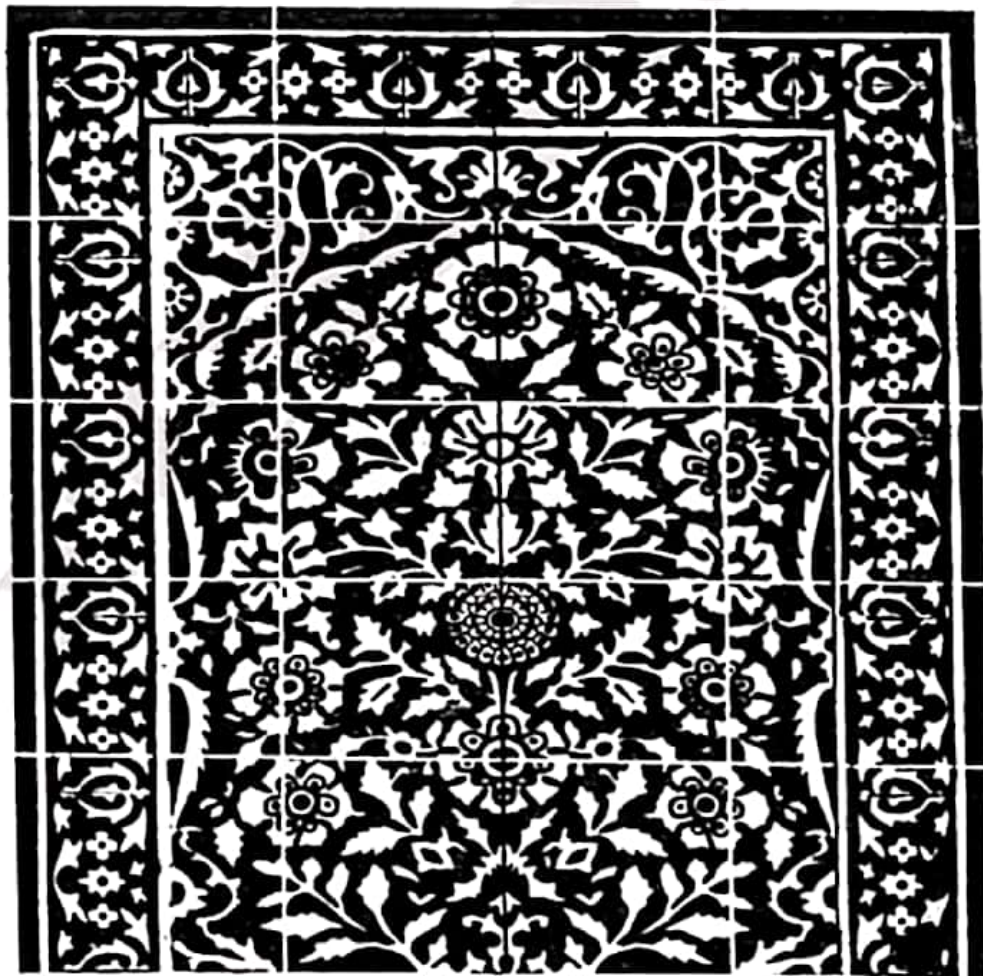
مغل سرائے

شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں ملگجے اندھیرے میں دھندلائے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار میں بہتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی اور وہ دونوں ایک ساتھ قدم اٹھاتے' یہاں' اس جگہ پہلی بار ٹھٹک کر رکے تھے۔

ابھی کچھ دیر پہلے پیچھے سے آتے ہوئے کھلنڈرے نوجوانوں کی ایک ٹولی بہت دیر تک انہیں اپنے گھیرے میں لئے چلتی رہی تھی اور وہ ان کے بیچ مجرموں کی طرح سر جھکائے بہت آہستہ قدم اٹھاتے یہاں تک پہنچے تھے۔ اب وہ ہنستی گاتی ٹولی بہت آگے نکل گئی تھی اور دور تک کوئی نہ تھا' البتہ ان کے کندھے ابھی تک آپس میں رگڑ کھا رہے تھے۔ لڑکا قدرے جھک کر چل رہا تھا اور اس کا بل کھایا ہوا بایاں بازو لڑکی کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھا۔

وہ دونوں اس خطے میں نو وارد تھے اور محض سنی سنائی پر یہاں تک نکل آئے تھے۔ اب وہ سفیدے کی قطار کے اس سرے پر آخری درخت سے ٹیک لئے کھڑے تھے اور دور تک ملگجا اندھیرا ہر طرف لوٹیں لے رہا تھا۔

دونوں اپنے سفری تھیلوں کے بوجھ سے ذرا ذرا آگے کو جھکے ہوئے' کسی حد تک ہراساں بھی تھے۔لڑکے نے ٹارچ نکال کر لوٹیں لیتے ملگجے اندھیرے میں دودھیا روشنی کی کمندیں ہر طرف پھینکیں اور مایوس ہو کر سر جھکا لیا۔ دونوں کو اپنی ٹانگیں زمین میں دھنستی ہوئی محسوس ہوئیں اور وہ دیر تک یہیں' اسی جگہ' بھاری سفری تھیلوں کے بوجھ تلے دبے' بے بسی سے آگے پیچھے جھولتے رہے۔

ان کو ان حالوں کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا ہوگا کہ ایک بڑے شور کے ساتھ دوسرپٹ آتے ہوئے گھوڑوں کے پیچھے دائیں بائیں جھولتی ہوئی بگھی ایک جھٹکے کے ساتھ ان سے چند قدم آگے نکل کر ساکت ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اطراف کے دروازے کھلے اور چمکتے ہوئے بھالوں کو سنبھالے' دو بجھے ہوئے چہروں والے افراد نے انہیں کمال تہذیب کے ساتھ بگھی میں نرم جھولا نما نشست پر لا بٹھایا اور چلے۔

لڑکی کو لپیٹ میں لئے ہوئے بازو کی گرفت اب ڈھیلی پڑ گئی تھی اور دونوں جس خوف کے ابھی کچھ دیر پہلے اسیر ہوئے تھے' وہ خواب و خیال ہوتا جا رہا تھا۔ وہ عجب خود سپردگی کے عالم میں ہوا کے دوش پر تھے اور تیز ہوا میں ان کے اوپر کو اٹھے ہوئے نرم کالروں میں آدھے چھپے ہوئے نیم خوابیدہ آنکھوں والے مطمئن چہرے دائیں بائیں جھول رہے تھے۔

ایک جگہ بگھی دھیرے دھیرے رکتی گئی اور انہوں نے جانا کہ جیسے ایک ٹھہرے ہوئے غضب ناک پانی کے دھارے کو راہ دی گئی ہو۔ وہ جب باادب خدام کا سہارا لئے بگھی سے باہر آئے ہیں تو سفری تھیلوں کے بوجھ سے ان کے کندھے آزاد تھے اور ان کے سامنے آبنوس کا پیتل جڑا' دیوہیکل دروازہ دھیرے دھیرے کھلتا چلا جا رہا تھا اور اس کے اندر کی سمت کھنچتے اور قوسیں بناتے ہوئے زنجیر' غضب ناک پانی کے دھارے کا شور باہر اگل رہے تھے۔

دروازے کی دونوں چوکیوں پر ٹھہرے ہوئے لیمپ پوسٹ اپنی زرد لرزتی ہوئی روشنی اگلتے' بہت نمایاں اور ایک حد تک افسردہ نظر آئے۔

وہ دونوں ایک بار پھر کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگے۔ لڑکے کے بل کھائے ہوئے بازو نے لڑکی کو ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سرخ بانات کی وردیوں میں کمر کے گرد دھاری دار پٹکے لپیٹے ہوئے پست قد خدام ان کے سفری تھیلوں کو احتیاط سے سنبھالے ''رپ رپ'' کرتے ان کے پیچھے چلے آتے تھے۔

استقبالیہ' کی نیم روشن محراب تلے' لٹکتی ہوئی مونچھوں اور کلوں سے کانوں کی طرف مڑی ہوئی نوکدار قلموں والے میزبان نے جھک کر انہیں خوش آمدید کہا اور ہمراہ ہولیا۔ وہ راستے میں بچھتا چلا جا رہا تھا اور اس چرب زبان نے مجال ہے کہ انہیں بات کرنے کا موقع دیا ہو...... وہ کہہ رہا تھا۔

''حضور یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ آپ کی خدمت کا موقع ہاتھ آیا۔ پرتگالی' ولندیزی' فرانسیسی اور انگریز سبھی ہمارے سر آنکھوں پر اور عرب ریاستوں کے شیخ تو ہمارے بھائی بند ہیں...... حضور خاطر جمع رکھئے......''

اس وقت وہ دھلی ہوئی سرخ اینٹوں والی راہداریوں پر چل رہے تھے اور ان کے دونوں اطراف میں کھلے تالاب کے شفاف پانی میں درختوں کا گہرا عکس کانپ رہا تھا۔ وہ کندھے سے کندھا ملائے چلے جا رہے تھے اور سامنے بچھتا ہوا میزبان۔

''بندہ پرور' ہمیں یقین ہے کہ مغل سرائے کا شہرہ سن کر ہی آپ چلے ہوں گے۔ یقیناً آپ نے جو کچھ سنا وہ الف سے یے تک درست ہے' یہاں سرائے کے مہمانوں کو روائتی مغل رکھ رکھاؤ کے ساتھ ٹھہرایا جاتا ہے اور اب کیا عرض کروں' عنقریب آپ خود کمال مہربان ہوں گے اور ہماری خدمات کے معترف بھی......''

گیندے کے پھولوں اور بنفشے کے دور تک پھیلے تختوں کو عبور کر کے وہ چیڑھ کے چھوٹے دروازوں والی قطار کے ساتھ ہو لئے۔ پھر تنگ غلام گردش کا مرحلہ آیا۔ یہاں ہر دس قدم پر دروازوں کے ساتھ سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی مشعلوں کا دھواں نیچی چھت پر سیاہی کا لیپ کر رہا

تھا۔ وہ احتیاط سے جھکے جھکے میزبان کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ پھر وہ ایک جگہ رکا اور ایک زنگ آلود تالے کو کھولتے ہوئے سامنے سے ہٹ کر ادب سے جھکا۔ تب ان کے سامنے ایک دروازہ مہیب چرچراہٹ کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ پھر وہ لپک جھپک اندر گیا اور آتش دان کو روشن کر آیا۔ وہ دونوں دروازے میں کھڑے تھے اور ملازمین ان کے سفری تھیلے کمرے میں ایک طرف رکھ کر کب کے جا چکے تھے۔ پھر میزبان نے جھک کر اجازت چاہی اور رفتہ رفتہ آتش دان میں چٹختی ہوئی لکڑیوں اور اڑتے ہوئے شراروں کی مدہم روشنی میں اندر کا ماحول واضح ہوتا گیا۔

ان کے سامنے نیچی چھت کے نیم روشن کمرے میں بھاری پلنگ کے سرہانے آتش دان کے عین اوپر دو ہلالی تلواریں' نیالے رنگ کے ڈھال کے آر پار ٹھہری ہوئی تھیں۔ کمرے میں دیواروں سے سہمے ہوئے ہرن اور بارہ سنگے بس کمرے میں نکلا ہی چاہتے تھے۔ پھر جانے کہاں سے جھک کر آداب بجالاتی' لچکتی ہوئی دو کنیزیں برآمد ہوئیں' دروازے میں سہما ہوا جوڑا جڑ کر کھڑا تھا۔ وہ آئیں اور لڑکی کو سہارا دیتی ہوئی بغلی دروازے میں غائب ہو گئیں۔ لڑکا' ہمت کر کے ان کے پیچھے چلا لیکن اس کے پاؤں نیچے بچھے ہوئے قالین میں دھنستے چلے جا رہے تھے اور وہ بڑی مشکل میں تھا' جانے کیوں اس پر غنودگی غلبہ پانے لگی اور وہ لڑکھڑا سا گیا۔ جب اسے ہوش آیا ہے تو اس نے دیکھا کہ اس کی ساتھی لڑکی کوئی مغل شہزادی ہے جو بڑے پلنگ پر اطلس و کمخواب میں ماہتاب کی طرح کھلی ہوئی ہے۔ اس لمحے وہ نیم غنودگی میں بغلی کمرے سے ہوتا ہوا دو نازک اندام کنیزوں کے بازوؤں میں لپٹا لپٹایا آگے بڑھ رہا تھا۔

اور وہ خود جیسے کوئی مغل شہزادہ' ڈھاکے کی ململ پر سنہری صدری اور کمر کے گرد پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ تھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالے ہوئے تھا' جس کے دستے پر ریشمی پھندنا اس کے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ جھول رہا تھا۔

وہ نیم غنودگی میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اور اس نے تخلیہ چاہا تھا۔ کمرے میں اب صرف مورچھل ہلاتی ہوئی دو کنیزیں رہ گئی تھیں اور شاید پلنگ پر نیم دراز مغل شہزادی نے کوئی فرمائش کر دی تھی۔ ایسے میں بغلی کمرے سے کوئی ایک وجود بہت گہرا گھونگھٹ نکالے ہوئے ظاہر ہوا تھا اور جھکی جھکی نظروں کے ساتھ چاندی کی اونچی سماوار' جس کے نیچے آگ دہک رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے' قرینے سے سجا کر پلٹ گیا تھا۔

وہ لڑکا جیسے کوئی مغل شہزادہ' بغیر کچھ کھائے پیئے پلنگ پر چت لیٹ گیا اور اس کی آنکھیں مندھتی چلی گئیں۔ شاید کچھ دیر سویا بھی ہو گا۔ اس اثنا میں برابر سے اٹھ کر اس کی ساتھی لڑکی...... مغل شہزادی نے کمرے کا چکر لیا اور پائیں باغ کی سمت کھلنے والی کھڑکی میں ٹھہری رہی۔

پھر جیسے جیسے رات بیت رہی تھی' نیچے دور تک نکل گئے گھنے درختوں میں عجیب طرح کی غراہٹوں کا شور ابھرتا چلا گیا۔ درختوں سے بھرا مار کر چڑیاں اور کوے شور کرتے ہوئے آسمان کی طرف اٹھنے لگے۔

شور بڑھ رہا تھا۔ باہر چاندنی میں راہداریوں کے ساتھ ساتھ تھوہر کی اونچی نیچی دیواریں گھاس کے تختوں پر ٹھہری ہوئی سنگ مرمر کی کرسیاں اور کاسنی پھولوں سے گندھی بنفشے کی موٹی تہیں سب رفتہ رفتہ ماند پڑ گئیں اور ہر سمت سے بڑھتا' کروٹیں لیتا ہوا' پاگل کر دینے والا شور ہر طرف بھر گیا۔

لڑکی گھبراہٹ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹتی گئی تھی' یہاں تک کہ کمرے میں میزبان کی آواز گونجی' '' حضور بے فکر رہیے۔ یہ شور خود کردہ ہے اور محض آپ کی تفنن طبع کی خاطر۔ اس وقت ہمارے تنخواہ دار ملازمین کی ٹولیاں پائیں باغ کے کونے کھدروں میں حرکت کر رہی ہیں۔ یہ بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ملی جلی آوازیں باہر کے مناظر میں قدرتی رنگ بھرنے کی

خاطر ہیں حضور...... بےفکر رہیے۔''

میزبان نے لپک کر باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کے سامنے ریشمی پردوں کو برابر کر دیا۔ آوازیں مسلسل آ رہی تھی' جیسے بھیڑیوں کے غول نکل آئے ہوں اور انہوں نے سرائے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا ہو۔ البتہ میزبان کی وضاحت سن کر لڑکی نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ پھر وہ پائیں باغ کو چلنے کے لئے ضد کرنے لگی۔ لیکن لڑکا تھکا ہوا تھا اور اسے نیند بھی آ رہی تھی۔

یکا یک لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور متجسس نگاہوں کے ساتھ قلانچیں بھرتی ہوئی کھڑکی سے دوسری طرف کود گئی۔ ایسے میں میزبان اسے پکارتا رہ گیا۔ وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے تنخواہ دار ملازمین کو درندوں کی مصنوعی آوازیں پیدا کرتے ہوئے ڈھونڈھ نکالنا چاہتی تھی۔ اوپر درختوں کی شاخوں سے الجھے ہوئے پرندے اس کے سر پر چکر کھاتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں آگے بڑھتے رہے اور وہ اپنے آپ میں مگن مغل سرائے کے پائیں باغ سے ملحقہ گھنے جنگل میں اترتی چلی گئی۔

اندر' سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں لڑکا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا' اور اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نیند میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا نام لے کر پکار رہا ہو۔ وہ کچھ دیر یوں ہی گم سم بیٹھا رہا پھر اس نے لڑکی کی بابت دریافت کیا۔ اس موقع پر میزبان کو اس نے پہلی بار پریشان دیکھا۔ وہ اپنے کمال تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنی چرب زبانی کا بے مثل مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کی کانپتی ٹانگیں اور اس کے چہرے پر کورے لٹھے کے کھلے ہوئے تھان اور اس کی نمناک آنکھیں اور زبان کی لکنت' سب اس کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔

لڑکا اپنی سنہری صدری پر لپٹے ہوئے پٹکے میں اڑسا ہوا جڑاؤ ٹھیک کا مڑا ہوا خنجر سنبھالتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کانوں میں پہنے ہوئے سفید مندرے' گلے کی مالائیں اور جڑاؤ بازوبند

وہیں نوچ کر پھینک دیئے۔ پھر وہ کونے میں رکھی ماند پڑتی ہوئی شال کو ایک ہاتھ میں تھامے پائیں باغ میں اتر گیا۔ سرائے کا میزبان اس کے پیچھے گرتا پڑتا چلا آتا تھا۔ نیچے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی اور لڑکا سب سے بے نیاز اس کا نام پکارتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ بالآخر صبح کی دھندلاہٹ میں وہ وہاں تک پہنچ ہی گیا جہاں چکر کھاتے اور اوپر سے جھکی ہوئی شاخوں میں الجھتے ہوئے پرند واویلا کر رہے تھے۔ دفعتاً قریب کی جھاڑیوں سے تیر کی طرح دو سائے نکلے اور جنگل کی ترائی میں گم ہو گئے۔

لڑکا اس کا نام لے کر وہیں جھک گیا تھا، بجھی ہوئی مشعل وہیں رہ گئی تھی اور اس کے ہاتھ کی گرفت کمر میں اڑسے، مڑے ہوئے خنجر پر ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

سورج اب دھیرے دھیرے خاصا اوپر اٹھ آیا تھا اور میزبان کہہ رہا تھا:

''حضور، مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے۔ ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اس سے ملحقہ علاقے میں جانے کیسے سچ مچ کے بھیڑیوں اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں، مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لئے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہو گی کہ آپ کے نقصان کی تلافی......''

ادھر سرائے کے اس نیم تاریک گوشے میں دبیز سرخ قالین پر دو سفری تھیلے رہ گئے تھے اور ان کے قریب ہی چاندی کی اونچی سماوار، جس کے نیچے راکھ اڑ رہی تھی اور بڑے تھال میں خشک میوے اور منقش صراحیاں اور بھاری پیالے جوں کے توں قرینے سے سجے رکھے تھے۔

○

مشکی گھوڑوں والی بگھّی کا پھیرا

میرا لڑکپن تھا یا لڑکپن اور جوانی کی سرحد کہہ لیجئے۔ میں اس سرحد پر کھڑا تھا اور گزرتے ہوئے بہت سے معمول کے مطابق دنوں میں سے ایک دن تھا۔

جب زندگی معمول سے زیادہ تیز تھی۔

لوگ شہر کے بیچوں بیچ بڑے چورستے میں سرخ اینٹوں کے بنے گلیر کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ چورستے میں ایستادہ' اس اونچے مینار کے گرد چاروں سڑکوں کا مقام اتصال' بڑے گھیرے کی گہری سبز مخملی گھاس کے چوڑے تختے تھے۔ چھڑکاؤ گاڑی منہ اندھیرے ہر طرف ہو گئی تھی۔

درمیان میں کھڑے کارندوں نے سیڑھی کو گلیر کے اوپر لے سر تک اٹھایا' جہاں ہڈیوں کا انسانی پنجر دھرا تھا۔

سامنے بڑے ہجوم کے درمیان چمکتی سنگینوں کے کڑے پہرے میں دھیرے دھیرے سیاہ پردوں سے پوری طرح ڈھکا سلاخوں سے بنا پنجرہ دھکیلتے ہوئے لایا جا رہا تھا اور لوگ بڑے سرکاری اہل کاروں کی موجودگی میں کارندوں کے کاندھوں پر ہڈیوں کے انسانی پنجر کو احتیاط کے ساتھ گلیر سے نیچے اترتے دیکھ رہے تھے۔

وہ انسانی پنجر'

میں شہر میں نو وارد چاروں جانب سپاٹ چہروں میں گھرا' اس کی بابت دریافت کرتا ہوں' جسے کندھوں سے اتارا گیا تھا۔ جواب میں سلاخوں سے بنے پنجرے کی طرف اشارہ کرتے لوگوں کے ریلے' سپاہیوں کی لاٹھیوں سے منتشر ہوتے' نظارہ کرنے کے لئے مناسب مقام کے انتخاب پر دھکم پیل کرتے ایک دوسرے پر گرتے رہے۔

بکھرتے ہوئے انسانی پنجر کو اس کے وارثوں کی موجودگی میں' سبز مخملی گھاس پر رکھے تابوت میں احتیاط کے ساتھ یک جا کیا جا رہا تھا۔ ان میں سے ایک تین سال کا بچہ' ایک طرف گھاس پر رکھے تابوت کے ڈھکنے پر بیٹھا یہ سب غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ہٹاؤ' ہٹاؤ' مارو''

ایک طرف بھگدڑ مچ گئی۔

لاٹھیوں کے ساتھ اٹھتے اور گرتے ہوئے لوگوں کو روندتی ہوئی چار مشکی گھوڑوں والی بگھی تیزی سے چورستے کا پورا چکر کاٹ کر اس باغی چور کے عمودی سلاخوں والے پنجرے کے برابر رک گئی۔

میں بہت بڑے ہجوم کے ساتھ اٹھتا گرتا سامنے کی رو سے بہت آگے نکل گیا۔ ابھی سنبھل نہیں پایا تھا کہ یکا یک میرے کھلے ہوئے گریبان کو دو مضبوط ہاتھ میری گردن پر کستے' یکجا کرتے' گھسیٹتے ہوئے مشکی گھوڑوں والی بگھی کی طرف لے چلے۔ میرے جھولتے ہوئے دونوں بازو رہ رہ کر کھردری زمین سے ٹکرا رہے تھے اور دونوں ٹانگیں چھڑکاؤ سے جمی ہوئی مٹی پر دو متوازی لکیریں تھیں۔

''اوئے' چھوڑ دو اسے''

میرے گریبان کے دونوں چاک آزاد ہو گئے۔ میں نے گھٹنوں کے بل سر اٹھا کر کنکر مٹی سے بھری آنکھوں میں اس کرخت آواز کو جگہ دی۔ اس کا کسا ہوا سیاہ فل بوٹ مشکی گھوڑوں

والی بگھی کے چمکدار پائیدان پر ٹکا تھا اور اٹھے ہوئے کالروں میں اس کی اکڑی ہوئی گردن......

میں گھٹنوں کے بل، رستے ہوئے خون میں مٹی سے لتھڑی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا، رفتہ رفتہ اپنے سامنے دیکھ پایا۔ دور ہجوم میں سے تابوت کے گزرنے کے لئے راستہ بنایا جا رہا تھا۔ سب سے پیچھے وہ بچہ تھا جو کچھ دیر پہلے تابوت کے ڈھکنے پر بیٹھا تھا۔ وہ رہ رہ کر اس طرف دیکھتا، دونوں پاؤں سے زمین پر ٹھوکریں مارتا چلا جا رہا تھا۔

اور وہ لوگوں کے سروں پر سے ہوتا ہوا تابوت۔

میرے قریب کھڑے ایک سپاہی نے گردن موڑ کر صورت حال کا جائزہ لیا۔

''میں اب تک نہیں جان سکا کہ وہ انسانی پنجر؟'' میں منمنایا۔

''چپ، حرامی۔''

اس نے ایک لحظہ کے لئے لاٹھی اٹھا کر، حقارت کے ساتھ میرے زمین پر ٹکے ہوئے سر کے پاس ہی ٹیک دی۔ اٹھے ہوئے کالروں میں اکڑی ہوئی گردن کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ مخملی گھاس کے قریب رکے ہوئے، سیاہ پردوں سے پوری طرح ڈھکے، سلاخوں سے بنے پنجرے کا دروازہ کھلا۔

آنکھوں پر سیاہ پٹی، آگے پیچھے جھولتے ہوئے سر، پشت پر اوپر تلے کسے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ وہ باغی چور باہر لایا گیا۔

ہر طرف بھگدڑ مچ گئی، کارندے اسے سہارا دے کر مخملی گھاس تک لائے جہاں وہ اوندھے منہ ڈھیر ہو گیا۔ چورستے میں ایستادہ گلیر کے ارد گرد بڑے گھیرے میں مخملی گھاس کے تختے تماشائیوں تک حد فاصل تھے۔

تب اٹھتے گرتے ہجوم میں سے، سفید براق لباس میں ملبوس ایک بوڑھی عورت کو جو اپنے دونوں ہاتھوں میں پیتل کی گڑوی اٹھائے تھی، اوندھے منہ باغی چور تک لایا گیا۔

اس وقت اوندھے منہ ڈھیر کے سرہانے اس پر لگائے گئے الزامات کی تفصیلات اونچی آواز میں پڑھ کر سنائی جا رہی تھیں۔ میں وہیں پڑے پڑے چاروں اطراف میں امڈتے ڈھیتے لوگوں کے ریلے کا تجسس بھانپ گیا تھا۔

وہ پیتل کی گڑوی

جسے بوڑھی عورت بہت سنبھال کر باغی چور تک لائی تھی۔

"ہر خاص و عام کو مطلع کیا جاتا ہے کہ۔۔۔"

باوردی مستعد کارندے کی آواز چاروں اطراف سے امڈتے ڈھیتے لوگوں کے شور میں شور تھی۔

اوندھے منہ ڈھیر باغی چور کا ثابت شدہ جرم خالص سونے کے بنے ہاتھی کی چوری تھا۔ لیکن سونے کا ہاتھی؟

یہ سوال صاف سخت زمین پر ٹکے منہ کے دانتوں تلے کچکچا کر رہ گیا جہاں حقارت کے ساتھ الٹی نیلی گئی تھی۔ پھر چاق و چوبند کارندے نے مشکیں کسے ہوئے باغی چور کی دونوں ٹانگیں جوڑ کر رسی سے ایک کر دیں۔ پشت پر بندھے ہوئے دونوں ہاتھ اور جڑے ہوئے پیروں کو یکجا کس دیا۔ درمیان میں کھڑے کارندے آئے اور بچی ہوئی رسیوں کے ساتھ اسے سیڑھی کے اوپر لے سرے سے جوڑ کر باندھ دیا۔ اوپر لے سرے کو اونچا اٹھاتے ہوئے اٹھا کر گلیر کے ساتھ ٹکا کر زور لگایا گلیر کے سہارے دھیرے دھیرے سیڑھی اوپر اٹھی۔ اوپر جہاں سے ہڈیوں کا انسانی پنجرا اتارا گیا تھا۔

باغی ہاتھی چور گلیر کی سرخ اینٹوں کے ساتھ رگڑ کھاتا رفتہ رفتہ اوپر اٹھ رہا تھا اور اس کی ڈھلکی ہوئی گردن ہر طرف جھولتی تھی۔

ابھی کچھ دیر پہلے چاروں اطراف کے بے قابو لوگوں کے شور میں مستعد کارندوں نے ہاتھی چور کو گلیر پر گڑے ہوئے لکڑی کے کھونٹوں کے ساتھ کس دیا۔ اس کا خاک آلود چہرہ گلیر

کے کنارے سے اس طرف ڈھلک گیا تھا۔ پیتل کی چمکتی ہوئی گڑوی اس کے قریب رکھ کر سیڑھی کھینچ لی گئی۔ اب گلیر پر باغی چور کا لیر لیر کرتا پھڑ پھڑا رہا تھا اور اس کا خاک آلود اس طرف ڈھلکا ہوا چہرہ۔

ایک بار پھر بھگدڑ مچ گئی' لاٹھیوں کے ساتھ اٹھتے اور گرتے ہوئے لوگوں کو روندتی ہوئی چار مشکی گھوڑوں والی بگھی' تیزی سے چورستے کا پورا چکر کاٹ کر ہجوم سے پرے نکل گئی۔

میں کھردری زمین سے' جمی ہوئی مٹی پر دونوں متوازی لکیریں آگے بڑھاتا' کہنیوں کے بل مخملی گھاس کے تختوں سے ہوتا' آگے بڑھتا رہا۔ کنکر مٹی سے بھری آنکھوں میں وہ کرخت آواز سمائی ہوئی تھی اور میرے گریبان کے دونوں چاک آزاد تھے۔

اب مخملی گھاس کے تختوں پر دھیرے دھیرے رات اتر رہی تھی۔ دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ درمیان میں گلیر کے نیچے وہ بوڑھی عورت' جو پیتل کی گڑوی وہاں تک لائی تھی' ابھی تک ساکت تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جھرجھری لی اور مجھے سہارا دیتے دیتے ہانپ گئی۔

''ماں جی' میں ابھی تک نہیں جان پایا کہ وہ انسانی پنجر؟'' میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے سینے میں اندر ہی اندر دیر تک آواز کی کپکپاہٹ محسوس ہوتی رہی۔ پھر وہ نہایت رازدارانہ انداز میں مجھ پر جھک گئی۔

''ہاتھی متعدی ہوتے ہیں بیٹا۔''

میں اسی طرح پڑے پڑے جب کبھی اوپر دیکھنے کی کوشش کرتا' پھڑ پھڑاتے لیر لیر کرتے سے ذرا اوپر مشکی گھوڑوں والی بگھی کا چمکدار پائیدان اندھیرے میں جھلملاتا۔

وہ اور آگے جھک آئی۔

''بیٹا ہاتھی متعدی ہوتے ہیں لیکن یہ سب نہیں مانتے۔ انہوں نے جس کسی کو بھی سونے کا ہاتھی تعمیر کرنے کو کہا وہ باغی چور ثابت ہوا' اور تم نے دیکھ لیا کہ باغی چور کی سزا......''

اوپر لیر لیر کرتا پھڑ پھڑا رہا تھا۔

اس نے بتایا کہ جب پہلے پہل یہ حکم ہوا تو ہر طرف ڈھنڈیا پڑی' نامی سنگ تراش جمع کئے گئے پھر ان میں سے ایک کو یہ کام سونپ دیا گیا۔ خالص سونے کی اوپر تلے رکھی سنہری اینٹوں میں گھرا وہ کام کرتا رہا۔ باہر چمکتی سنگینوں کا کڑا پہرا تھا۔

اچانک ایک روز' جب کہ کام تکمیل پا چکا تھا' سنگ تراش کے گھر سے خالص سونے کا ہاتھی برآمد ہوا۔ اس گلیر سے اترنے والا پہلا انسانی پنجر اسی باغ چور کا تھا...... جب سے باغی چوروں کا گوشت چیل کووں کا کھاجا ہے اور پنجر کے سوا ہڈیاں' تیز ہوائیں اور بارشیں اڑا لے جاتی ہیں۔

''ہاتھی متعدی ہوتے ہیں بیٹا۔ لیکن یہ سب نہیں مانتے۔''

چورستے میں دور تک پھیلے مخملی گھاس کے تختوں پر رات اب پوری طرح اتر آئی تھی۔ لیر لیر کرتا میری کنکر مٹی سے بھری آنکھوں میں سمائی ہوئی کرخت آواز کے بیچ زور زور سے پھڑ پھڑا تا رہا۔ میں جان گیا تھا کہ گلیر پر کھونٹوں کے ساتھ کسا جانے والا اس کا بیٹا ہے۔ میں جمی ہوئی مٹی پر کھنچی متوازی لکیروں سے دور نکل آیا تھا۔

میرے گریبان کے دونوں چاک آزاد تھے......رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی۔

پو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے آواز کی کپکپاہٹ اندر ہی اندر اس کے سینے میں پھر محسوس ہوئی۔

''جانتے ہو اس پیتل کی گڑوی میں کیا ہے؟ گڑ...... ہوائیں اور بارشیں گڑوی کو لڑھکا دیں گی اور تپش گڑ کو پگھلا دے گی۔ پھر وہ گلیر سے نیچے بہہ نکلے گا۔ جمار ہے گا اور اس میں سے ریشم کا کیڑا پیدا ہو گا جو ریشم بنے گا' بنتا رہے گا۔ پھر کسی روز میرا باغی بیٹا اس ریشم کی ڈور کے سہارے نیچے اتر آئے گا۔ میں اسے چھپا کر رکھوں گی۔ اسے لے کر کہیں دور نکل جاؤں گی۔''

یہ سب بتاتے ہوئے اس نے مجھے سہارا دینے کی کوشش کی اور ہانپ کر رہ گئی۔ اب صبح کا ہر طرف پھیلتی روشنی میں چورستے کی زندگی واپس آ رہی تھی۔ میں نے اسے چلے جانے کو

کہا۔ گھاس کے مخملی تختے پر پڑے پڑے میں اسے دیکھتا رہا اور وہ دور سڑک پر ایک طرف کھڑے لوگوں کے جمگھٹے میں کھو گئی۔

میری کنکر مٹی سے بھری آنکھوں میں سمائی کرخت آواز کے بیچ' لیر لیر کرتا پھڑ پھڑاتا رہا اور کسے ہوئے فل بوٹ کی ایڑی آنکھوں میں اندر ہی اندر اترتی چلی گئی۔

پھر چاروں اطراف سے بند' گنبد کے عین نیچے میں نے اپنی نشست کا جائزہ لیا۔ اندر ہر طرف بکھری خالص سونے کی اوپر تلے رکھی سنہری اینٹوں کے انبار تھے اور مجھے ان اینٹوں سے سنہری ہاتھی تعمیر کرنے کو کہا گیا تھا۔ باہر چمکتی سنگینوں کا کڑا پہرہ تھا اور چاروں اطراف سے بند گنبد کے عین نیچے یہ میرا پہلا دن تھا۔

باہر کی زندگی معمول سے زیادہ تیز تھی اور میری آنکھوں میں لیر لیر کرتے کی پھڑ پھڑاہٹ نے شام کر دی تھی۔

چورستے کے بیچوں بیچ ایستادہ گلیر کے پیچھے دور دور تک گہرے نیلے آسمان میں سرخ رنگ حل ہو رہا تھا اور رات کے کسی پہر گلیر کے اوپر لے سرے سے دھیرے دھیرے ریشم کی ڈور تھامے' بے قابو ہڈیوں کا پنجر' نیچے مخمل کی گھاس کے تختوں کی جانب اتر رہا تھا۔

○

ایکٹ: یادگار محفوظ

''شور مت کیجئے' سارا کھیل آرام سے دیکھئے۔''

بازیگر نے کھلے آسمان تلے' کھلیان کی صاف سخت زمین پر کڑا کھینچ دیا ہے' جس کے اندر آنے کی اجازت نہیں۔ تالیاں ..... سیٹیاں۔

رات کا پچھلا پہر ہے' تمام لوگ تماشا کرتے ہیں۔

دودھیا چاندنی میں گہرے نیلے آسمان کی طرف دھیرے دھیرے اوپر اٹھتا ہوا دھوئیں کا ایک دائرہ ہے۔ بازیگر نے کچھ دیر پہلے مٹی کے تیل کو منہ میں ڈال کر زور سے آسمان کی طرف تھوکتے ہوئے آگ دکھائی تھی۔

سب حیرانی سے دھوئیں کے نیالے دائرے کو اوپر اٹھتا دیکھتے ہیں۔

وہ مجمع کے بیچ' پانی سے غرارے کرتا ہوا دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ اس کی سیاہ قمیص کی ایک آستین ہوا میں آگے پیچھے جھول رہی ہے' جس کے اندر دایاں بازو کہنی پر سے کٹا ہوا ہے۔

دھوئیں کا دائرہ بہت اوپر جا کر ہوا کے رخ پر پہاڑوں کی جانب مڑ جاتا ہے۔ دور اس کے بالکل نیچے پرانی بارہ دری ہے' جو دریا کے چمکتے پانی میں ایک دھبے کی طرح نظر آتی ہے۔

پس منظر میں سیاہ اونچے پہاڑ ہیں، جن میں سے گزرتا، بل کھاتا ہوا پانی پھیل کر بارہ دری کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔

نگاہیں بازیگر کے ساتھ دائرے میں گردش کرتی ہیں۔

تالیاں...... سیٹیاں۔

بچے اگلے کرتب کے لئے بے چین ہیں۔

''شور مت کیجئے، سارا کھیل آرام سے دیکھئے...... پاؤں کی جگہ کوئی نہ چھوڑے، لک ٹوٹ جاتے پر اس کی موت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔'' یہ ہدایات سب کے لئے ہیں۔

بازیگر رک کر کٹے ہوئے بازو کی آستین سے پسینہ پونچھتا ہے۔ چاروں طرف دیکھتا ہے۔ تمام لوگ اس کی موت نہیں چاہتے۔ لک ٹوٹ جانے کی ننگی تلوار سب کے سروں پر لٹک رہی ہے۔

''یہ دیکھئے، میرا ہاتھ۔''

وہ ہتھیلی چاروں طرف گھما کر دکھاتا ہے۔

''میری ہر انگلی کی پور پر رنگ آف سالومن ہے، یہ شمس کا ابھار دیکھ رہے ہیں آپ۔ اس پر یہ کراس...... یہ میری لک لائن ہے، واضح اور صاف۔''

زور زور سے گھوم کر بتاتا ہے۔

اس کی بات کو نہ سمجھتے ہوئے، گیس کی مدھم روشنی میں تمام چہرے لٹک گئے ہیں۔ چھوٹے سے سرخ رنگ کے شامیانے کے اونچے بانس کے ساتھ ٹنگے ہوئے لاؤڈ اسپیکر سے مزید تفصیلات سنائی دیتی ہیں۔

''ملاحظہ کیجئے...... جان جوکھوں کا کھیل...... ٹنڈا چیمپئن، ایک سو چار طریقوں سے سائیکل چلتی دیکھئے...... ٹنڈے چیمپئن کا ساری دنیا کے سائیکل چیمپئنوں کو چیلنج...... انعام......''

انعام کی تفصیلات سن کر سب حیران ہیں ۔قنات کے پیچھے گاؤں بھر کی عورتوں کی گفتگو کا موضوع انعام کی رقم ہے۔سب گلا پھاڑ کر عورت ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہیں ۔

شامیانے تلے چارپائی پر بیٹھا سفید وزنی چادر والا بڈھا' جس کے سفید بال چادر کا ہی ایک حصہ معلوم ہوتے ہیں' جھک کر اپنی لالٹین کی لو بڑھاتا ہے اور اٹھ کر زمین پر کھنچے ہوئے کڑے کو عبور کرتا ہے۔

''شہادت کی انگلی نوکدار ہے...... دولت' بے اندازہ دولت' اور پھر شہرت' عزت......''

ٹنڈا چیمپین لکیروں کی تفصیلات بتا رہا ہے۔ بوڑھا بڑھ کر اس کا ہاتھ روشنی میں لیتا ہے اور آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے جھک کر مشتری کے ابھار پر بہت باریک لکیر تلاش کرتا ہے۔ سر اور قسمت کی لکیر کٹی کٹی اور دھندلی ہے...... اعصابی دورے...... فیصلہ کرتے وقت سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتا۔

بوڑھا زندگی کی لکیر پر ٹھہر جاتا ہے' جو درمیان سے ٹوٹ گئی ہے۔

''اب تمہاری عمر کیا ہوگی؟''

''کیوں' آپ کو حیرانگی ہوئی نا کہ میں اس وقت یہاں چل پھر کیسے رہا ہوں؟ یہی بات ہے نا...... پریشان نہ ہوں۔ یہ سپورٹنگ لائن ہے' بہت صاف......''

اس لائن کو جس کسی نے سپورٹنگ کہا ہے' صرف چاندی بنائی ہے' بوڑھے کا تجربہ بولتا ہے۔

دماغ کی لکیر کے آخر میں تین شاخیں بہت واضح نظر آ رہی ہیں ۔

''یہ کسی ہاتھ میں دیکھا تم نے بابا' لیکن اس کے درمیان میں یہ دائرہ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''یہ پاگل پن کا ثبوت ہے۔''

بابا نتیجے پر پہنچ گیا ہے۔

''شور مت کیجئے ......سارا کھیل......''

شور کرتے ہوئے پانی میں گھری' تاریک بارہ دری میں' جس کے آس پاس ابھی تک
مٹیالا دھواں پوری طرح ہوا میں تحلیل نہیں ہوا۔ دور سے آتی لاؤڈ اسپیکر کی مدھم آواز اس کے
دل کا خوف دور کرتی ہے۔ بازیگر کا کھیل شروع ہونے سے لیکر اب تک' وہ موقع کی تلاش میں
ہے۔ بہت احتیاط سے آگے بڑھتا ہے۔

رات بیت رہی ہے۔

اچانک اس کا ہاتھ جیسے ٹھنڈی سیل سے چھو جاتا ہے۔ گھپ اندھیرے میں بارہ دری کے
بیچوں بیچ' کوئی خاموش' بے حس و حرکت' پہلے سے موجود ہے۔

اس کے دائیں ہاتھ کی گرفت خنجر پر مضبوط ہو جاتی ہے۔ جنبش نہیں کرتا' ادھر سے پہل کا
منتظر ہے۔ اب وہ دونوں چپ چاپ آمنے سامنے فاصلے سے بیٹھے ہیں۔ ان کے عین سر پر
نیلے ٹین کی تختی لگی ہے۔

''ایکٹ: یادگار محفوظ'' نچلے باریک حروف دن کی روشنی میں بھی نہیں پڑھے جاتے۔

بالکنی سے اس پار' کھلے آسمان پر روشن ستارے آہستہ آہستہ ماند پڑتے جا رہے ہیں۔
نیچے' دریا کی لہریں بارہ دری کی بنیادوں کی مٹی بہا رہی ہیں۔

وہ بغیر مڑے کن اکھیوں سے جنگلے کے پار' بالکنی سے نیچے دیکھتا ہے...... اس طرف سے
بارہ دری بہت اونچائی پر ہے' نیچے نہیں دیکھا جاتا۔ بہت نیچے نوکدار چٹانیں اور گہری کھائیاں
ہیں۔ اس جگہ دریا کا پاٹ کم چوڑا ہے۔ اس لئے پانی بہت تیز چلتا ہے۔

بالکنی کے سامنے دونوں ایک دوسرے کے حملے کے منتظر ہیں۔

بارہ دری کے اندر چھت کے نقش و نگار اب دھندلا گئے ہیں۔ مٹتے ہوئے رنگوں میں
جڑے' بچے کھچے آئینے' چاند کی روشنی میں دمکتے ہیں۔ دائیں ہاتھ دالان میں بہت بڑا چبوترہ
ہے' جس کے وسط میں ٹوٹے ہوئے فوارے کی بنیادیں نظر آ رہی ہیں۔ ہریاول میں' بولی کے
کانٹوں کے ساتھ پیلے اور جامنی رنگ کے پھول کھلے ہیں۔ اس چھوٹے سے دالان میں لمبی

گھاس سے ڈھکا گہرا کنواں ہے۔جس میں لوہے کی پانچ سیڑھیاں اتر کر نیچے پانی کی سطح تک چلی جاتی ہیں اور نیچے......

دور چھوٹی سرخ اینٹوں کی محرابیں اس بارہ دری کی حد بندی کرتی ہیں' جن کا رنگ بارشوں کے پانی اور تیز دھوپ نے ماند کر دیا ہے' سرخی کی جگہ کلونس نے لے لی ہے۔

بارہ دری میں دریا کی مخصوص آواز صدیوں سے گونج رہی ہے۔ تیز چلتے پانی کی آواز میں وہ دونوں ساکت' سانس روکے' ایک دوسرے پر پہل کرتے ڈرتے ہیں۔

دور سے تالیوں اور سیٹیوں کی آواز وقفے سے آتی ہے۔

''......شور مت کیجئے' سارا کھیل......''

۳

کرتب دکھاتے ہوئے' ٹنڈے چیمپئن کی نظریں پہاڑوں میں گھری بارہ دری کی طرف بار بار اٹھ جاتی ہیں۔ مطمئن ہو کر کھنچے ہوئے کڑے کے درمیان پڑی سائیکل کو سنبھالتے ہوئے پانی سے غرارہ کرتا ہے۔

''یا علی مدد' جو بچہ تالی نہیں بجائے گا وہ اپنی ماں......''

بچے ماں کی گالی کو تالیوں کے شور میں دبا دیتے ہیں۔

''بابا' دیکھو یوں لگتا ہے جیسے دریا کے کنارے پانی میں بارہ دری دھیرے دھیرے رینگ رہی ہو۔''

دور گہرے نیلے آسمان کے پس منظر کے ساتھ بارہ دری پانی میں رینگتی ہے۔

''اور جو دیکھتے دیکھتے' ابھی اسی وقت دریا میں سرخ اینٹیں کھیل کھیل ہو جائیں؟''

''یہ آنکھ کا دھوکا ہے۔''

وزنی چادر والا بوڑھا اس کا خوف دور کر دیتا ہے۔

''ہاں محض آنکھ کا دھوکا...... ورنہ ہوتو کچھ اور رہا ہوتا ہے۔ ہماری آنکھ تو سامنے کی

چیزیں دیکھتی ہے اور اس میں دھوکا کھا جاتی ہے۔ کیوں بابا؟''

بابا کی آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہیں۔ وہ جواب نہیں دیتا' اپنے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان اناؤنسر کے اور قریب ہو جاتا ہے۔

''کیوں میاں' تمہیں یاد ہے؟ لیکن تب تم بہت چھوٹے تھے۔ تب ایسا ہی ایک بازیگر آیا تھا۔''

نوجوان تماشا دیکھنے میں منہمک' انکار میں گردن ہلاتا ہے۔

''یاد نہیں آیا...... جب اگلے روز صبح مچھیروں کو بارہ دری کے قریب دو لاشیں ملی تھیں' دریا کے پانی میں اس بیلے کی جھاڑیوں میں الجھی ہوئی...... اور ان میں سے ایک لاش اس بازیگر نوجوان کی تھی۔''

''اللہ جانے بابا...... اب تماشا بھی دیکھنے دو۔''

نوجوان ناگواری سے پہلو بدل کر سامنے رکھی چلم میں تمباکو بھرنے لگتا ہے۔ بڈھا چادر کے نیچے سفید بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہے۔

تالیاں...... سیٹیاں۔

اب دائرے کے عین وسط میں بازیگر سائیکل پر کرتب دکھاتے ہوئے ایک چھوٹا دائرہ بنا رہا ہے۔

''شور مت کیجئے......''

لاؤڈ اسپیکر اپنا سبق دہراتا ہے۔

نوجوان مائیک رکھ کر' نے منہ میں لئے چلم کو آگ دکھاتا' انگوٹھے سے تمباکو دباتا ہے۔

''بیٹا' مجھے لگتا ہے جیسے یہ بازیگر سارا کھیل دہرا رہا ہے۔ ٹھیک بیس سال پہلے ایسی ہی ایک رات تھی' اسی جگہ وہ کرتب دکھا رہا تھا۔ تب میں جوان تھا' بالکل تمہاری طرح' اس لاؤڈ اسپیکر پر بچوں کو چپ کروانے کے لئے میں تھا...... شور مت کیجئے' جانی بازیگر...... بیٹا اس

کا نام جانی تھا۔''

وہ اس سے زیادہ خوبصورت جوان تھا' نیلے رنگ کا چمکدار لباس پہنے۔ اس کے بدن میں جیسے ہڈی تھی ہی نہیں۔

اب بازیگر سائیکل پر چکر کاٹتے ہوئے اپنی قمیص اتارتا ہے' پھر پہنتا ہے۔

''بیٹا سن رہے ہو؟ پھر میں اسے دیکھنے گیا۔ اس کی صورت پہچانی نہیں جاتی تھی' بس میں نے اسے اس کی قمیص سے پہچانا تھا۔ یقین مانو اسے دیکھ کر......'' ٹھنڈی سانس لیتا ہے۔ اس کی چادر کندھوں پر سے کھسک آئی ہے۔ ہلکی ہوا میں اس کے سفید بال اڑ رہے ہیں۔

اب ٹنڈا بازیگر سر جھکائے سائیکل چلا رہا ہے۔ اس نے کٹے ہوئے بازو کی کہنی ہینڈل پر ٹکا رکھی ہے اور دوسرے ہاتھ سے سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا ہے۔

''بابا' ان قصوں میں اب کیا رکھا ہے' کھیل دیکھو۔''

''اب اگلا کرتب ملاحظہ کیجئے' سات بچے میدان میں آ جائیں' شاباش آ جاؤ...... ملاحظہ کیجئے' ان سات بچوں پر سائیکل کس طرح گزاری جاتی ہے۔ شور مت کیجئے سارا کھیل......''

بازیگر' گیس والے بانس کے ساتھ سہارا لے کر بچوں کو ہدایات دینے لگتا ہے اور اس کی نظر دور چمکتے پانی میں رینگتی ہوئی بارہ دری پر ٹھہر جاتی ہے۔

''اس کی آنکھ دیکھتے ہو......''

بڈھا' ایک بار پھر پرانے قصے کی تمہید باندھتا ہے۔

''میں نہیں چاہتا' یہ بھی......''

''کیسی باتیں کرتے ہو بابا......''

''تمہیں یقین نہیں آتا' لاؤ تمہیں اس سے بڑا تماشا دکھاؤں۔''

بڈھا اس سے مائیک لے لیتا ہے۔

''شور مت کیجئے' سارا کھیل آرام سے دیکھئے اب میں بتاؤں گا' اس کنویں کا طلسم......''

''یہ اسی کنویں کا طلسم بول رہا ہے۔''
ایک منچلا آوازہ کستا ہے۔لوگ ہنستے ہیں۔
''بارہ دری کے اس کنویں میں پانچ سیڑھیاں اترتی ہیں جو نیچے پانی کی سطح تک چلی جاتی ہیں......''

بڈھا جیسے سارا راز فاش کرنے لگا۔ بازیگر پریشان ہوکر شامیانے کی طرف دیکھتا ہے اور تیزی سے سائیکل چلاتے ہوئے ساتوں بچوں پر سائیکل کو جمپ دے کر گزر جاتا ہے۔

بچوں کی چیخوں کے ساتھ تالیوں اور سیٹیوں کی آواز ابھرتی ہے۔ بازیگر کڑے کو توڑتا ہوا' اندھیرے میں ڈھلوان کی طرف نکل جاتا ہے۔

سب راستہ چھوڑ کر اس کے پلٹنے کا انتظار کرتے ہیں' جہاں اندھیرے میں وہ گھل گیا ہے۔ بچے کپڑے جھاڑ کر تالیاں بجاتے ہیں۔

''ہاں تو میں بتا رہا تھا اس کنویں میں پانچ سیڑھیاں اترتی ہیں جو نیچے پانی کی سطح تک چلی جاتی ہیں اور نیچے پانی کی سطح سے ذرا اوپر پانچ دروازے ہیں' لوہے کے بنے یہ پانچوں دروازے خفیہ راستے ہیں۔ زمین کے نیچے نیچے سے ایک سرنگ دریا کے دوسرے کنارے تک لے جاتی ہے۔ دوسرا راستہ پہاڑ کے اس پار۔ اور...... آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ بازیگر اب واپس نہیں آئے گا۔ وقت اپنے آپ کو دہراتا ہے...... تماشا ختم ہوگیا۔''

لوگ حیران ہوکر بوڑھے اناؤنسر کی طرف دیکھتے ہیں۔ کچھ نوجوان ٹنڈے بازیگر کو تلاش کرنے کھلیانوں میں دور تک نکل گئے ہیں۔

اب چھوٹے بچے بازیگر کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے' میدان میں ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے نیا کڑا بناتے ہیں۔
''ہرا سمندر' گوپی چندر' بول میری مچھلی کتنا پانی۔''
''اتنا پانی...... ہرا سمندر......''

''یقین مانیئے' تماشا ختم ہو گیا۔ بہت پہلے ایک بازیگر خزانہ چرا کر اسی کنویں کے راستے دوسرے کنارے نکل گیا تھا۔ یہ میرے باپ نے بتایا تھا۔ اور جب آنے والے بارہ دری میں پہنچے تو یہ جگہ اسی طرح ویران تھی جیسی آج ہے اور انہیں کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ یقین مانئے کچھ بھی نہیں۔''

''ہرا سمندر' گوپی چندر......''

دور بارہ دری میں بازیگر کے ساتھی کو مکمل یقین ہے کہ وہ سب کچھ ابھی تک کسی کے ہتھے نہیں چڑھا۔ اس نے ابھی تک پہلو نہیں بدلا۔ اسی طرح حملہ کرنے کے لئے مستعد بیٹھا ہے۔

لوگوں میں گھرا' نوجوان اناؤنسر حیران ہے۔

''کھیل ختم ہو گیا۔ کھیل ختم ہو گیا۔''

نوجوان اناؤنسر تیزی سے ہجوم کو چیرتا' بارہ دری کا رخ کرتا ہے۔

تمام لوگ یوں اچانک تماشا ختم ہو جانے پر حیران' بدمزہ' اپنے بچوں اور عورتوں کو گھروں کی طرف ہانکتے ہیں۔ بارہ دری میں' گھر جاتے بچوں اور جوانوں کی تالیوں اور سیٹیوں کی آوازیں آتی ہیں۔

''حضرات' کیا آپ جانتے ہیں۔ دوسرا کھیل ابھی جاری ہے۔ میں اس کی تفصیل بیان کرتا ہوں۔''

اب گھروں کو جاتے ہوئے لوگ ہنستے ہیں۔

سرخ شامیانہ لوگوں کے ہجوم میں لیر لیر ہو کر بکھر چکا ہے۔

میدان اب خالی ہو رہا ہے۔ سب کے ہاتھوں میں سرخ شامیانے کے بڑے بڑے چیتھڑے ہیں۔ جس پر بچوں میں چھینا جھپٹی ہو رہی ہے۔

بالکنی میں وہ' خنجر ہاتھ میں لئے مستعد' پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہے اور بات کی ابتدا کرتا ہے۔

''مجھ سے پہلے تم یہاں؟''

دوسرا خاموش رہتا ہے۔

''خیر یار' اب پچھلا پہر ہے۔ وقت کم رہ گیا ہے۔ صبح سے پہلے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے' ہم دونوں آپس میں بانٹ لیں گے' کیوں؟''

بارہ دری میں نووارد سمجھوتہ کرتا ہے۔ دوسرا گم متھان بیٹھا ہے۔

''کہیں تم دیوانے تو نہیں ہو' بات سمجھو بھی' صبح قریب ہے۔''

دور سے آتی آواز بارہ دری میں گونجتی ہے۔

''میں یہ سب صدیوں سے سن رہا ہوں۔''

بڈھا لاؤڈ سپیکر پر ہذیان بکتا چلا جاتا ہے۔

نوجوان' بالکنی میں تھک کر پہلو بدلتا ہے۔ اسے اپنی ناکامی کا احساس اب شدت سے ہونے لگا ہے۔

''تم پہلے آدمی ہو گے اور میں دوسرا۔ جو پو پھٹنے پر ان کو اپنے احمق ہونے کا مکمل یقین دلائیں گے......''

غصے سے پیچ کھاتے ہوئے' وہ لہجے کی نرمی برقرار رکھتا ہے۔ مفاہمت چاہتا ہے۔

''دیکھو اب بھی وقت ہے' آؤ سب کچھ لے کر کنویں کی سیڑھیاں اتر چلیں۔''

دوسرا اب بھی خاموش بیٹھا ہے۔

نووارد اچانک تڑپ کر اٹھتا ہے اور پہلے کے بہت قریب آ جاتا ہے۔ غور سے دیکھتا ہے۔ سورج کی پہلی کرن' اس کے بالکل سامنے رکھے سیاہ پتھر کے بت کی ایک آنکھ روشن کر دیتی ہے۔ دوسری آنکھ بے نور ہے۔

شاید مجھ سے پہلے آنے والا......

یکایک اسے یہ خیال پریشان کر دیتا ہے۔ پتھر کا بت اس کے سامنے ہے' جسے وہ تمام

رات اپنا مدمقابل سمجھا کیا۔ سورج کے اوپر اٹھتے ہی چمک سے اس کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور وہ اندھا دھند خنجر سے بت کی دوسری آنکھ نکالنے لگتا ہے۔

اس کے قہقہوں کی گونج میں بوڑھے اناؤنسر کے مدہم قہقہے شامل ہو جاتے ہیں ساری بستی قہقہوں کی زد میں ہے۔

اسی لمحے، سامنے، اندھے بت کے پیچھے، کھیل کا نوجوان اناؤنسر نمودار ہوتا ہے۔

''آرام سے، رک جاؤ...... پیچھے جنگلہ کمزور ہے۔''

نوجوان اناؤنسر کا سانس بری طرح پھولا ہوا ہے۔

آواز سن کر وہ ایک ہاتھ میں خنجر اور دوسرے میں چمکدار آنکھ لئے بوکھلا کر پیچھے ہٹتا ہے۔

''آرام سے، رک جاؤ......'' نوجوان اناؤنسر اسے مشورہ دیتا ہے۔

باقی جملہ دور، نیچے، نوکدار چٹانوں اور گہری کھائیوں تک جاتی ہوئی بھیانک چیخ مکمل کر دیتی ہے۔ اناؤنسر بدحواس ہو کر پلٹتا ہے۔ لمبی گھاس، پیلے اور جامنی پھولوں کو روندتا ہوا۔ گرتا پڑتا، آبادی کی سمت اترتی عمودی سیڑھیوں کی طرف بڑھتا ہے۔

ٹنڈا چیمپئن، اس کی واپسی کا منتظر، اندھیرے میں سے نکل کر بالکنی اور اندھے بت کے درمیان ڈولتا ہے۔ ایسے میں دور کھلے میدان میں بوڑھا اناؤنسر چیخ چیخ کر رات بھر کے جاگے، لوگوں کی نیند خراب کرتا ہے۔

اس وقت اندھے بت کے سامنے بالکنی کا ٹوٹا ہوا جنگلہ دریا کی سمت جھول رہا ہے، جہاں سے نیچے دیکھا نہیں جاتا۔ بہت نیچے نوکدار چٹانیں اور گہری کھائیاں ہیں۔ اس جگہ دریا کا پاٹ کم چوڑا ہے، اس لئے پانی بہت تیز چلتا ہے۔

○

نقّالوں کی رات

سنتے آئے ہیں کہ گاہ کے دنوں میں، چھدرے بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں دلوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔ سیٹیاں بجاتی ہوا میں چیخ سنائی نہیں دیتی اور بجلی کی چمک، برچھی کی لپک کو نگل جاتی ہے۔

بس ایسے ہی دن تھے۔ ابھی پورے طور پر سردیوں کا آغاز نہیں ہوا تھا، اور کھلے، بھرے ہوئے کھلیانوں پر چاروں اطراف سے گھٹائیں اُنڈی چلی آ رہی تھیں۔

بابا لوگ گرمیوں کی طویل دوپہروں کے ڈھلنے پر کفِ افسوس مل چکے تھے۔ پوری پارٹی کے ہاتھوں میں گھسے ہوئے تاش کے بدرنگ پتے تھے اور ایک دوسرے سے پٹ کر اس نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے تھے کہ آج جیتا کون ہے اور ہارا کون۔

''آخر جیت کس کی ہوئی؟'' ایک نے پوچھا۔

''جیت ٹیکری والے کی؟ جیت مغلوں کے حجرے کی ہوئی۔'' سب نے مل کر جواب دیا۔
مغل میں تھا اور مغلوں کا حجرہ جوں کا توں تھا۔ سیلن زدہ ٹھنڈا فرش، گھپ کمرہ اور بغیر تاکوں کی چوکور کھڑکیاں، جن میں سے باہر کا اندھیرا اندر در آیا تھا۔

یکایک بھگدڑ مچ گئی۔ لڑکے اندھیرے میں ایک دوسرے پر گر رہے تھے اور چلتے ہوئے

جوتے کی آواز کے ساتھ طویل، دور جاتی چیخیں کھڑکیوں میں سے باہر کے اندھیرے کو دھکیلتی، حجرے کے چاروں طرف پھیلی خود رو سار کی جھاڑیوں میں دم توڑنے لگیں۔

جوتا چل رہا تھا اور مغلوں کا حجرہ جوں کا توں تھا، جیسے میرے باپ دادا چھوڑ کر گئے تھے اور حجرے میں اپنے بڑوں کے نقال، بابا لوگ، سلین زدہ فرش، گھپ کمرہ اور بغیر تاکوں کی چوکور کھڑکیوں میں سے اندر گرتا ہوا اندھیرا۔

جب ہوش آیا تو جوتا میرے ہاتھ میں تھا اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرف چلاؤں اور اندر بوجھل تاریکی سہمی ہوئی تھی۔ میں سوچتا رہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر میں نے اپنے ایک کان پر ہتھیلی جمائی اور دوسرے کان پر جوتا، پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیخا۔

''کوئی ہے؟''

بوجھل اندھیرے سے ٹکرا کر میری آواز کی بازگشت چاروں طرف ٹوٹ کر بکھر گئی۔

جواب میں مسکینے نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ اندر حبس تھا اور باہر حجرے کے چاروں اطراف میں سیٹیاں بجاتی ہوا اور سار کی سرسراہٹ۔ تب زور سے بجلی کڑکی اور ہم نے آسمان پر تنتے ہوئے آہستہ خرام مٹیالے بادلوں کو دیکھا، اور اندھیرے میں سیلے ہوئے فرش پر گھٹنوں کے بل چل کر اپنے اپنے پیر ازتلاش کرتے ہوئے دروازے کی چوکھٹ پر آ کر ٹھہر گئے۔ سامنے پھر ایک لمحے کے لئے، دھیرے دھیرے آسمانوں پر بہتے ہوئے پانی سے شرابور بادبان روشن ہوئے اور گاؤں سے دو کوس پرے جرنیلی سڑک پر گرج ٹوٹ کر گری۔

''یار سنا ہے، موت سے کچھ دیر پہلے مرنے والے کی آنکھوں میں ایسی ہی تاریکی چھانے لگتی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

میری آنکھوں کی دونوں پتلیاں ایک لحظہ کے لئے پھیلیں، اور میں نے دیکھا کہ سامنے کا منظر بھیانک تھا، کٹا پھٹا ہوا بے ڈھب اندھیرا......

''یہی کہ دوپہر بھی ہو، تو بھی یوں لگتا ہے جیسے اندھیرے کا غبار پھیلتا چلا جارہا ہے اور سب طرف جیسے شامیں پڑگئیں۔''

''اچھا۔''

''لیکن یار ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔'' وہ دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔

''کہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا تو نہیں ہو رہا کہ باہر ہر طرف دوپہر ہو اور ہم سمجھ رہے ہوں کہ شام ہوگئی۔''

مسکینے نے مجھے بھی الجھا دیا۔

''یار ہم کتنی دیر کھیلتے رہے ہوں گے؟ جب تاش کھیل کر اٹھے ہیں، تب کیا وقت تھا؟ اور کیا سب دوستوں میں آج پھر جوتا چلا تھا۔''

میں نے اتنے بہت سے سوال داغ دیئے۔

''یار مجھے تو لگتا ہے، جیسے یہ سب بیتے ہوئے دنوں کی یاد ہے۔ کہیں ہم دونوں مغلوں کی اس چوکھٹ پر دم ہی نہ دے جائیں۔''

یہاں پہنچ کر دونوں کو سانپ سونگھ گیا اور سیٹیاں بجاتی ہوا میں سار کی سرسراہٹ مدھم پڑ گئی۔

''تم نے اذان سنی تھی؟'' بہت دیر بعد مسکینے نے سوال کیا۔

''نہیں، لیکن ہوگئی ہوگی۔ ہم نے دھیان نہیں رکھا۔''

''یار اتنا دھیان تو رکھنا چاہئے نا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی دن اذانیں ہوں ہی نا، دوپہر ہو، اور ہماری آنکھوں میں اندھیرے کا غبار پھیلتا جارہا ہو۔''

ہم دیر تک یوں ہی حجرے کی چوکھٹ پر بیٹھے رہے۔ پھر یکایک خیال آیا، کہیں گھر والے ہمیں ڈھونڈ ہی نہ رہے ہوں۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور سار کو دونوں ہاتھوں سے ہٹاتے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتے گھروں کو چل دیئے۔

ابھی چھینٹا نہیں پڑا تھا اور گہرے بادل چاروں طرف سے بہت جھکے ہوئے تھے۔ سار کے طویل جنگل کو گزار کر ہم چپ چاپ گاؤں کے تین اطراف میں پھیلے ہوئے متعفن پانی والے جوہڑ کے کنارے چل رہے تھے کہ حضرت صاحب کے دربار کی طرف سے نوبت کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ ہم دونوں ٹھٹھک گئے۔

آج جمعرات بھی نہیں تھی' پھر آخر کیا وجہ ہوئی؟ نوبت کی آواز برابر آ رہی تھی۔

جانے کتنی دیر تک ہم یوں ہی بے حس و حرکت کھڑے رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے رفتہ رفتہ جوہڑ کے کنارے کا کیچڑ ابھر کر ہمارے قدموں میں آ گیا ہو اور دھیرے دھیرے ہم اندر ہی اندر دھنستے جا رہے ہوں۔ جوہڑ کے کنارے بڑے بڑے نیالے رنگ کے مادہ مینڈک' گلے پھلا پھلا کر گا رہے تھے اور حضرت صاحب کی طرف سے نوبت کی آواز ہر گھڑی بدلتے ہوئے ہوا کے رخ پر ہمارے دائیں بائیں سے ہو کر گزر رہی تھی۔

سامنے جرنیلی سڑک کے پار' گرج ایک بار پھر ٹوٹ کر گری اور میں نے دیکھا کہ دربار کے اونچے کلس آہستہ خرام بوجھل بادبانوں میں گھرے ہوئے تھے اور نوبت کی گھٹی گھٹی آواز......

یکا یک میرے پیچھے کھڑے مسکینے نے ایک چیخ ماری اور کمان سے نکلے سنسناتے ہوئے تیر کی طرح میرے قریب سے نکل گیا۔ میں ٹھہرے ہوئے گدلے پانی میں جاتے جاتے رہ گیا اور بڑی مشکل سے سنبھلا تھا۔ معمول کے دنوں میں یہ غیر معمولی گھڑیاں تھیں اور وقت جیسے ٹھہرا ہوا تھا۔

میں کانپتا ہوا' دبے پاؤں' سانس روکے اپنی گلی تک آیا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا تھا۔ مجھے ڈیوڑھی سے صحن تک جانے میں شاید بہت وقت لگ گیا۔ گھر کے صحن میں' یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی سورج ڈوبا ہو۔ میرے گھر لوٹ آنے پر کسی نے توجہ نہ دی۔ سامنے برابر برابر بچھی ہوئی بان کی جھلنگا کھاٹوں پر کوئی نہیں تھا اور کونے میں سریں کے نیچے تنور کے ٹھڑے پر سرسراتا ہوا

سایہ میری ماں کا تھا۔

عجیب بات ہے، ابھی ابھی تو یوں لگا تھا جیسے رات کا دوسرا پہر ہو گا۔ میں پھر نکل آیا۔

نوبت کی آواز گلیوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔ میں اس کی انگلی تھامے، بے سوچے سمجھے دربار کی طرف چل پڑا۔ لوگوں کے جتھے اس طرف رواں تھے۔ گلے میں رومالوں کی جگہ نئے دستر خوان لپیٹے، چرچراتی چپلوں کے ساتھ ہر قدم پر بلم اور منقش ہاکیاں ٹیکتے، ماہیے کی تانیں ایک دوسرے سے اچکتے ہوئے، ویروتا جے باجے کے گاؤں والے۔ ان کے درمیان میں پھانٹ دار کرتا پہنے ایک نوجوان تیل سے چپڑے ہوئے گل مچھوں پر ہاتھ پھیرتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے آگے آگے چل رہا تھا۔

ہم مغل شہزادے، اکثر تپتی دوپہروں میں اپنے پالتو کتوں کو ساتھ لئے تاجے باجے تک پھیلے ہوئے میرے میں گیدڑوں کے پیچھے نکل جاتے تھے۔ اور رات گئے واپسی پر تاجے باجے کی کھڑی فصلوں کو اجاڑتے، لوٹ مار کرتے، للکرے مارتے ہوئے آتے تھے...... میں تاجے باجے کے اکثر لڑکوں کو جانتا تھا، لیکن اس ٹولی میں کوئی بھی شناسا چہرہ نہ تھا۔ ان کے ماہیے کی تانیں برابر میں کھڑی ہماری حویلی کی دیوار پر سے ہوتی ہوئی اندر صحن میں جھانک رہی تھیں۔

''بے غیرتے۔''

تاجے باجے والے ہمارے بڑوں کے کامے تھے۔

اس وقت مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے رکنا چاہا لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی اس گاتی ہوئی ٹولی کے پیچھے چلتا رہا۔

دربار کے باہر سیمنٹ کے اونچے چبوترے پر اور اس کے ساتھ ساتھ دور تک لوگ بیٹھے ہنسی ٹھٹھا کر رہے تھے۔

درمیان میں پڑ بنا ہوا تھا اور دربار کے اونچے کلس سے قطار در قطار نیچے آتے ہوئے زور

زور سے پھڑ پھڑاتے سیاہ جھنڈے کے نیچے ملنگوں کے ڈیرے میں نوبت بج رہی تھی۔ ملنگوں کے چھپر سے لے کر نیم دائرے میں دربار کی دیوار تک سروں سے اوپر نکلتی ہوئی مشعلیں روشن تھیں اور چاروں اطراف سے اُمڈتی ہوئی گھٹائیں حضرت صاحب کے دربار کے عین اوپر جمع ہو رہی تھیں۔

تماشا شروع ہی ہونے والا تھا۔ نوبت روک دی گئی۔ میں بہت دیر تک کیمے اور فیکے کو ڈھونڈتا رہا۔ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

درمیان میں دریاں بچھتے ہی سازندے آ گئے اور ان کے پیچھے چھم چھم کرتے بنے سنورے نقال چھوکرے۔ چار سو بھٹکتی ہوئی مشعلوں کی زرد روشنی میں وہ سارے کے سارے گھوم کر ادائیں دکھاتے' اک دوجے کے کولہوں پر چٹکیاں بھرتے تھے۔

ایک دوسرے کے مقابلے میں للکرے اور سیٹیاں مار مار کر دونوں گاؤں کے نوجوان بے حال ہو گئے۔ درمیان میں رکھے روشن ہنڈوں کو دربار کی دیوار پر لٹکا دیا گیا اور درمیان میں کھڑے' بڑی مشعل والے نے ''ہا'' بھری۔

''ہا'' کی تیز آواز اوپر اٹھی' ہر طرف پھیلنے کا جتن کرتی ہوئی' لیکن جیسے دربار کی دیواروں اور نیم دائرے میں ڈٹے ہوئے لوگوں کی باڑ سے راستہ نہ پا کر وہیں ٹھہر گئی۔ اوپر بادلوں نیالے بادبان اور جھک آئے تھے۔ میں نے فضا میں سارنگی کی تیز آواز کو جمے ہوئے دیکھا۔ سنتا رہا۔ نگاہوں سے چھوتا رہا۔ اس جمی ہوئی آواز کے بے شمار رنگ تھے ایک دوسرے سے متحارب' حل نہ ہونے والے اور نیچے دربار کے احاطے میں بدلہ لینے کے طویل سلسلے تھے جو ہمارے گاؤں سے تاجے باجے تک نکل گئے تھے۔ زمانے ہوئے' گاہ کے دنوں میں برچھی کے چمکتے ہوئے پھل نے جو خون کی لہر سر سے گزاری تھی' اس لہر میں آج بھی اپنے پرائے کی پہچان کھوئی ہوئی تھی۔

سامنے روشن مشعل کی تھرتھراتی زرد روشنی میں ''ہا'' بھرنے والے سانگی کا کھلا ہوا منہ

اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ ایک ہاتھ کان پر اور مندھی ہوئی آنکھیں۔

یوں لگتا تھا جیسے اردگرد بیٹھے للکرے مارتے ہوئے جوان اور بچے سب اس ''ہا'' بھرنے والے کو رو رہے ہوں اور چھم چھم کرتے بنے سنورے سانگی چھوکروں کے چہروں کا لیپ بہہ گیا ہو۔ ان کے سینوں کے مصنوعی ابھار ڈھلک گئے ہوں اور تیز بارش نے ان کے ریشمی کپڑوں میں سے مردانہ جسموں کو نمایاں کر دیا ہو۔

میں بوکھلایا ہوا' تیزی سے اٹھا اور برابر کی تاریک گلی میں کود گیا۔ میں واپس جانا چاہتا تھا' گھر کی جانب۔

لیکن گھر میں تو ابھی کچھ دیر پہلے سورج ڈوبا تھا۔ صحن میں برابر برابر بچھی ہوئی بان کی جھلنگا کھاٹیں' اجی کے سرہانے نیچی لالٹین اور کونے میں سریں کا پیڑ' جس کی سرسراہٹ ایسی تھی جیسے مسلسل پتے گر رہے ہوں۔

میں تاریک گلی میں تھا' ایک لمحے کے لئے کڑکڑاتی دوپہر نے گھیر لیا اور میں ننگے پاؤں' آنکھوں میں اندھیرے کا غبار لئے ہوئے بھٹک گیا۔

''ویل...... ویل' تاجے باجے کے شیرے کمہار کی ایک روپے کی ویل...... ہزار کی ویل۔''

میں فوراً پلٹا۔ میں تاجے باجے کے شیرے کمہار کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ جس نے گزشتہ سوموار' منڈی میں لمبی کبڈی کھیلتے ہوئے قینچی مار کر میرے لالے کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ میں نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن شیرے کی گال پر سے روپے کا نوٹ' سانگی چھوکرے کی چٹکی کے ساتھ اٹھتے ہوئے نہ دیکھ سکا۔ میں نے اپنے بالکل سامنے اونچے طرے والے کا شانہ دبایا۔

''شیرا کہاں ہے جی؟''

''وہ سامنے کھڑا ہے اپنی ماں کا خصم۔ پھانٹ دار کرتے میں۔''

میں ابھی پھانٹ دار کرتے میں اس ماں کے خصم کو تلاش نہیں کر پایا تھا کہ میرے دائیں بائیں بہت سی گھٹی گھٹی آوازیں آئیں۔ یہ سب لوگ اس کی کنواریوں کے ساتھ اپنے رشتے جوڑ رہے تھے۔ پھر بوندا باندی شروع ہوگئی' رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ لوگ اٹھنے لگے۔

درمیان میں لوچدار چھوکرے اسی طرح لہک لہک کر گا رہے تھے اور ان کے ہر ہر ٹھمکے پر فریاد کی آواز آتی تھی۔

''ویل۔ ویل' لکھ کی ویل' شیرے تاجے باجیے کی پانچ باری کی ویل......ایک روپے کی ویل۔''

کھڑے ہوئے مشعل والے سانگی استاد نے روپیہ اپنی ڈھیلی پگڑی میں اڑستے ہوئے ایک بار پھر ''ہا'' بھری۔

میں گلی کے اندھیرے سے آگے نکل کر روشنی میں جانا چاہتا تھا' کیا پتا پھانٹ دار کرتے میں شیرا تاجے باجیہ نظر ہی آجائے میں ابھی آگے نکل جانے کا راستہ ہی ڈھونڈ رہا تھا کہ کسی نے میرے کالر میں ہاتھ ڈال کر پیچھے گھسیٹ لیا۔

وہ مسکینا تھا۔ اندھیرے میں اس کے چمکتے ہوئے سیاہ چہرے پر شیطانی مسکراہٹ تھی اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''میرے پیچھے چلے آؤ۔'' اس نے سرگوشی کی۔

اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا' تاریک گلی میں دور تک اتر گیا۔ سانگی استاد نے چار بیتے کے بعد ادھالے والا مشہور کبت شروع کر دیا تھا۔ ناچنے والوں کے کسے ہوئے کولہوں پر بجتے ہوئے چمڑے کے پٹاخے کی ''ٹھاہ' ٹھاہ'' گاؤں کے باہر جمے ہوئے تاریک سناٹے کو چھو کر واپس پلٹی اور اس میں تماشائیوں کے قہقہوں کی گونج......

اب باقاعدہ بارش شروع ہوگئی تھی۔

''ہوا کیا ہے؟'' میں مسکینے کے پیچھے لپکا۔

''بس نکل آ مرزے' تو نہیں جانتا۔ آج خون خرابا ہو کر رہے گا۔ تاجے باجیے بھی خالی ہاتھ نہیں آئے۔ ہر ایک کی ڈاب میں طمنچہ ہے اور اپنے گاؤں والے مرزے بھی تیار ہیں۔ بس دو گھڑی کی دیر ہے' ایک دوسرے کو بچھا کر رکھ دیں گے۔ آج کچھ ہو کر رہے گا۔ مرزے تو دشمن داری والا ہے۔ بس چلا آ۔''

میں لشتم پشتم مسکینے کے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے خود کچھ دیر پہلے کڑکتی بجلی کی چمک میں دربار کے پچھواڑے' اندرکوٹ سے آنے والے اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں میں چادروں میں لپٹی برچھیاں دیکھی تھیں۔

ہم گلی کا لمبا چکر کاٹ کر حجرے والے رستے تک پہنچ گئے۔ اب گاؤں ایک طرف رہ گیا تھا اور سامنے کچے راستے کے ساتھ ساتھ جوہڑ کے ٹھہرے ہوئے پانی میں سرے دانی کی سلائیوں والی تیز بارش ہو رہی تھی۔ سامنے حجرے کے چاروں اطراف میں پھیلی سارکی پراسرار سرسراہٹ میں دربار سے آتی ڈھولک کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی چھما چھم پناہ ڈھونڈ رہی تھی۔ اب مینہہ نے اپنا زور دکھانا چاہا تھا۔

ہم پنڈلیوں تک کیچڑ میں لت پت چلتے رہے۔

''یار تو نے شیرے کو دیکھا تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے اسی طرح کانپتے ہوئے جواب دیا۔

''مرزے' خدا کی قسم اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور اس کے بازوؤں کی مچھلیاں تڑپ رہی تھیں۔ میں نے خود دیکھا ہے' پھر وہ اٹھ کر باہر نکل گیا تھا۔ میں نے وہیں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ آج کچھ ہو کر رہے گا۔''

میرے آگے آگے مسکینا لمبے ڈگ بھرتا جا رہا تھا۔ اس کے کیچڑ میں چلنے سے ''پچاک' پچاک'' کی آواز کے ساتھ اٹھتے چھینٹے' میرے کندھوں سے گھٹنوں تک مٹی کا لیپ کر رہے

تھے' جسے سرے سلائی والی بارش کی تیز دھار اکھاڑ رہی تھی۔

مسکینا حجرے کو چھوڑ کر اس کچے راہ پر پڑ گیا جو برساتی نالے کے کنارے کھڑے شہتوتوں کے جھنڈ کے نیچے سے نکل کر جرنیلی سڑک تک جاتا تھا۔

''مرزے' پارسال انہی دنوں میں شیرے کی بہن کا ادھالا ہوا تھا۔ تاجے باجے والوں نے لمبی کبڈی میں بھی مار کھائی تھی اور ناک بھی کٹوا بیٹھے تھے۔ لیکن یار اس سال تاجے باجے تیاری کے ساتھ آئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے' کا ے اپنی اوقات بھول گئے ہیں...... شیرا اپنی بہن کے ادھالے کا بدلہ ضرور لے گا۔''

میں نے چلتے ہوئے زور کا ہنکارا بھرا۔

ابھی ہم جرنیلی سڑک کو نہیں چڑھے تھے کہ اوپر تلے ''ٹھاہ' ٹھاہ'' کی تیز آوازیں چاروں طرف جمی ہوئی تاریکی کو چیرتی ہوئی نکل گئیں۔ یہ سانگی استاد کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے چمڑے کے پٹے کی آواز نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے طمنچہ چل گیا ہو۔

''مرزے' نقال چھوکروں کے کولہوں کا کمال دیکھا۔ ہر طرف ''ٹھاہ' ٹھاہ'' کرادی نا۔'' آگے چلتے ہوئے مسکینے نے وضاحت کی۔

''یار کہیں گڑبڑ تو نہیں ہوگئی' یہ طمنچہ کی آواز لگتی تھی۔''

''ممکن ہے' لیکن نہیں یار لڑائی کی بنیاد پڑتے ہوئے بھی دیر لگتی ہے۔''

''بنیاد کا ہے کی؟ کوئی گنجائش بھی رہ گئی ہے؟''

''کچھ پتا نہیں چل رہا یار۔ آج ہم سمجھ رہے تھے کہ عصر کا وقت ہوگا لیکن پتا چلا شام ہو گئی۔ اذانیں ہم نے نہیں سنیں۔ گھر میں ابھی کچھ دیر پہلے سورج ڈوبا ہے...... دیکھی بھالی چیزیں آج کچھ اوپری اوپری نظر آرہی ہیں۔''

مسکینا چپ تھا۔

ہم دونوں جرنیلی سڑک تک آکر چھوٹی پلی کے نیچے بیٹھ گئے اور چپ کا کہرا ہر طرف

پھیلتا گیا۔ پلی کے نیچے بہتے پانی کے شور میں دور سے آتی' ڈوبتی ابھرتی ڈھولک کی تھاپ سنائی دے رہی تھی۔

ہمیں وہاں بیٹھے بیٹھے زمانے بیت گئے۔ ایک وقت آیا کہ ڈھولک کی تھاپ اپنی سر بگاڑ بیٹھی اور سنگریزوں سے ٹکراتے پانی کی سرگم رہ گئی۔ پھر پلی کے دونوں سرے ایک لمحے کو روشن ہوئے اور سامنے دربار کے اونچے علم کے پیچھے بجلی لہرائی اور گاؤں کی طرف سے آتے کچے راستے پر سرپٹ آتی ہوئی مشکی گھوڑی ایک لمحے کو ہم دونوں کی نظروں میں ٹھہر گئی۔

میں نے دیکھا کہ گھوڑی پر پھانٹ دار کرتے والا آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کی کمر میں پیچھے سے آیا ہوا ایک گورا بازو حمائل تھا۔ میرے خیال کی تصدیق مسکینے نے کر دی۔ شیرے کے پیچھے لشکتی ہوئی مشکی گھوڑی پر لہراتے ہوئے پھانٹ دار کرتے کے ساتھ جمے ہوئے گورے بازو کو ہم دونوں نہیں پہچان پائے تھے۔

جرنیلی سڑک کے اوپر آ جانے سے تاجے باجے کو جانے والے راستے پر گھوڑی کی ٹاپوں کے ساتھ اٹھتی ہوئی چنگاریاں ہم دونوں نے دیکھیں۔ پھانٹ دار کرتے پر سختی سے حمائل گورے بازوؤں والے گدرائے ہوئے وجود کو سنبھالے شیرا ہوا ہو گیا تھا۔ اس کی مشکی گھوڑے کے پاؤں میں جیسے کمانی لگی ہوئی تھی اور اس کا لہراتا ہوا پھانٹ دار کرتا پرچم بن کر یوں اوپر اٹھا تھا' جیسے چاروں اطراف میں پھیلے ہوئے آسمان کے بادلوں کے جھولتے ہوئے خیمے کو طنابوں سمیت اکھاڑ پھینکے گا۔

ہم نے جرنیلی سڑک کی پلی کے نیچے ایک عمر گزاری تھی۔ میں نے مسکینے کے سر پر چمکتے ہوئے چاندی بالوں کو چھوا۔

''یار مسکینے ......ہم بھی بوڑھے ہو گئے۔'' جواب میں وہ شیطانی ہنسی ہنستا رہا۔

سڑک پر دور جاتی ہوئی چنگاریاں گھپ اندھیرے میں معدوم ہو گئی تھیں۔ ہم اپنی جھکی ہوئی کمروں پر ہاتھوں کا سہارا لئے' سر پر چاندی کا بوجھ سنبھالے' پنڈلیوں تک کیچڑ سے ہوتے'

گاؤں کو جانے والے راستے پر ہو لئے۔

اگلے روز گاؤں میں زندگی معمول کے مطابق تھی۔ ہم نے کسی سے بھی رات کے ادھالے کی بات نہیں سنی۔ پھر کسی نے بتایا کہ مرزوں کے للکروں کا تاجے باجے والوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور شیرا اپنے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ بے غیرتے کیا جواب دیں گے۔

میں نے اپنی برف بھوئیں اوپر اٹھائیں اور دھندلائی ہوئی آنکھوں سے مسکینے کی طرف دیکھا۔

''یار، یہ لڑکے کیا کہتے ہیں۔''

''مرزے، یہ کبھی کبھی ہوتا ہے کہ باہر ہر طرف دوپہر ہو اور ہم سمجھیں کہ شامیں پڑ گئیں۔''

مسکینے نے ڈھیتی ہوئی آواز میں جواب دیا' اور سب کو چپ سی لگ گئی۔

○

دل کے موسم

اس بدکار کے داہنے گال پر تل ہے' اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے۔ جب بات کرتی ہے تو یاقوتی ہونٹوں کے نگینے اپنے رنگ بدلتے ہیں۔

اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے' گاؤ تکیے دھرے ہیں۔

وہ اوپر والے مالے میں رہتی ہے' جہاں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ اوپر جاتا ہوا بل کھاتا چوبی زینہ بہت سنبھل کر قدم رکھنے پر بھی انگڑائیاں توڑتا ہے۔

نچلی منزل میں وہ رہتا ہے' جس نے یاقوتی ہونٹ نہیں دیکھے۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ نگینے کس طرح رنگ بدلتے ہیں۔ بس سنا ہے کہ اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی ہیں اور بول ترشے ہوئے نگینے۔ اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے اور گاؤ تکیئے دھرے ہیں۔

پہلے پہل' جب وہ یہاں نیا نیا آیا تھا' تو ایک شام اوپر کے مالے سے پھوٹتا ہوا نقرئی قہقہہ ہر طرف بڑھتے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں جوار بھاٹا بن گیا تھا اور وہ لہروں کی مار پر اکیلا تھا۔ اٹھتی گرتی' مترنم لہروں کے جھکورے اسے برآمدے میں لئے لئے پھرے۔ اوپر کے مالے میں ہونٹوں کے نگینے رنگ بدل رہے تھے اور وہ نڈھال' برآمدے کی ریلنگ پر جھکتا چلا گیا تھا۔

اس شام اس نے تیز دھوپ اور بارشوں سے سیاہ، چوبی زینے کی چرچراہٹ پہلی بار سنی تھی۔ جوار بھاٹا ٹھہر گیا تھا اور کوئی بہت آہستہ، سنبھل کر قدم رکھتا اوپر سے اتر رہا تھا۔ پھر نیچے آتی اکھڑی ہوئی سانسیں، بل کھاتے ہوئے زینے میں چکر کھاتی، لڑکھڑاتی، اندھیرے میں اندھیرا ہو گئیں۔

مہیب، ٹھاٹھیں مارتی تاریکی، رات بھر پرسکون رہی اور اس نے وہیں ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کر دی۔

پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی اپنے چاہنے والوں میں گھرتا چلا گیا۔

مدتیں گزر گئیں، وہ اس حجرے میں گوشہ نشین، کمرے میں بچھی ہوئی صف پر اپنے صادق العقیدت مریدوں کو حالت جذب میں استغفار کی دھیمی اور تیز صداؤں کے بہاؤ میں ڈوبتے ابھرتے دیکھتا رہا ہے۔

وہ اولین شام کے اندھیرے کا مترنم پھیلاؤ، توبہ استغفار کے شور میں کہیں کھو گیا ہے۔

اس نے ہمیشہ اپنے مریدوں کے روبرو اس بدکار کے ذکر اذکار سے اجتناب برتا ہے، لیکن کسی نہ کسی حوالے سے یاقوتی ہونٹوں اور رنگ بدلتے ہوئے نگینوں کا ذکر چھڑ ہی جاتا ہے۔ صادق العقیدت مرید نہیں جانتے کہ استغفار کی دھیمی التجائیں کیسے آن کی آن میں تیز ندی کا روپ دھارتی ہیں اور ندی کی اٹھتی گرتی لہروں میں ان کا ہادی، مرشد بہتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہوتا ہے اور اوپر کے مالے سے بہت سنبھلے ہوئے قدم، ڈگمگا کر چکر کھاتے ہوئے سرمئی اندھیرے کو اجاڑ دیتے ہیں۔ چوبی زینے کی چرچراہٹ، رات بھر کی ٹھاٹھیں مارتی، پسپا ہوتی تاریکی میں کھو کر پرسکون ہو جاتی ہے۔

زمانے بیت گئے۔

اوپر لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے اور اس نے دیکھا نہیں، بس سنا ہے کہ اس کے داہنے گال پر تل ہے اور اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی……

وہ جانتا ہے کہ اپنے چاہنے والوں کے سامنے بھاؤ بتاتے ہوئے وہ اکثر اس پر چوٹیں کرتی، پھبتیاں کستی ہے۔ اس نے بھی اسے کبھی اچھے حوالوں سے یاد نہیں کیا، لیکن وہ اولین شام کے اندھیرے کا پھیلاؤ اب ایک مشکل بنتا جارہا ہے۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت مصیبت اپنے سر لے لیتا ہے۔

جوار بھاٹا تھم نہیں چکتا، اندر کی ہر شے تہہ و بالا ہوگئی ہے۔

گزشتہ کئی روز سے سب کا ہادی، مرشد خاموش ہے۔ مریدوں کو حجرے تک آنے کی اجازت نہیں۔

وہ برآمدے کی ریلنگ پر جھکے جھکے صبح کرتا ہے اور اسی صورت میں شام۔ سرمئی اندھیرا خاموشی سے بڑھتا رہتا ہے، پھیلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ سپیدہ سحر نمودار ہوتا ہے۔

باہر زینہ بھی خاموش ہے۔ بہت دنوں سے اوپر بھی کوئی نہیں گیا۔

آج شام سمیت تمام شامیں گونگی ہیں اور وہ ریلنگ پر ترازو، دونوں جانب جھول گیا ہے۔ صدیاں گزر گئیں۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی، آج پہلی بار اپنی بالکنی تک آئی ہے۔

نیچے یکا یک جانے کہاں سے اتنی خلقت امڈ پڑی ہے۔ تیز سیٹیوں کے شور میں سب گرتے پڑتے اوپر ہی کھنچے چلے آتے ہیں۔ اتنے چہروں میں دمکتے صادق العقیدت مریدوں کے چہرے، ریلنگ پر ترازو مرشد کی آنکھوں میں دھندلا جاتے ہیں۔ چوبی زینہ بوجھ سے کڑکڑاتا ہے۔

مرشد برآمدے کی ریلنگ سے گھسٹتا، اندر حجرے سے اوپر جاتی ہوئی، ان سیڑھیوں تک آتا ہے جن کے دروازے پر قفل ڈال دیا گیا تھا۔

باہر سیٹیوں اور تالیوں کا شور بھری ہوئی تاریکی کے مستقل ریلے ہیں، جو بل کھاتے چوبی زینے سے ہوتے ہوئے بند دروازوں پر دستک دیتے ہیں۔

یکا یک شام کے سرمئی اندھیرے کے پھیلاؤ میں یاقوتی ہونٹوں کے بول ترشے ہوئے نگینے اپنا رنگ بدلنے لگتے ہیں۔

سب شانت ہر طرف سکوت چھا جاتا ہے۔

وہ بالکنی سے جھک کر کھانستی ہوئی بہت ٹھہر ٹھہر کر ہمیشہ کے لئے دھندہ چھوڑ دینے کا اعلان کرتی ہے۔

ہر طرف سے احتجاج کرنے والے اندر ہے ہیں۔

کہتے ہیں برے دنوں میں یاقوت......

مرشد سرمئی اندھیرے کی اٹھتی گرتی مترنم لہروں پر تنکا تھا جو بہتا ہوا کانپتے ہاتھوں سے اوپر جاتی ہوئی تاریک سیڑھیوں کا دروازہ کھولتا ہے۔

پہلی سیڑھی پر قدم دھرتا ہے۔

باہر کا شور مدھم پڑتا جا رہا ہے اور چوبی زینے کی ٹوٹتی انگڑائیاں دوسری سیڑھی کے بعد تیسری...... کچھ بھجائی نہیں دیتا۔

لڑکھڑاتے قدم وہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب رواں ہے۔

سیڑھیوں کی تاریک سنسناہٹ میں کوئی بہت آہستگی سے سنبھل کر قدم رکھتا اس کے قریب سے ہو کر نیچے حجرے کی جانب نکل جاتا ہے۔

یہ اپنی دھن میں اوپر پہنچتا ہے۔

اوپر پہنچ کر دیکھتا ہے کہ سجے سجائے دو خالی کمرے ہیں۔ ایک میں چاندنی بچھی ہے گاؤ تکئے دھرے ہیں۔ ایک طرف کپڑے سے ڈھکے ہوئے ہارمونیم طبلہ اور چمڑے میں منڈھے ہوئے گھنگھروؤں کی ایک جوڑی ہے۔

بالکنی میں رنگین چلمن اندھی ہوا کے ساتھ جھول رہی ہے اور نیچے سیٹیاں شور......اس کے صادق العقیدت مرید......

○

گمشدہ کلمات

بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر تیر رہے تھے۔ عصر کا وقت ہو چلا تھا اور دریا ایک حد تک پرسکون تھا۔

نشیب میں آبادی کے چاروں اطراف سے گرتی ہوئی پگڈنڈیاں ادھر ادھر بکھرے ہوئے آجڑیوں اور ڈھور ڈنگروں کو رفتہ رفتہ سمیٹنے لگی تھیں۔

''ہا...... ہا'' کی ڈوبتی ابھرتی آواز کے ریلوں میں چھڑی کی پھٹکار کے ساتھ دائیں بائیں طرح دے کر نکل جانے والی چست گائیں اور دودھ پیتے بچھڑے بچھڑیاں چاروں اطراف سے چوکڑیاں بھرتے بڑھے چلے آتے تھے۔ سامنے ساری آبادی میں چپ چڑانگ تھی اور پگڈنڈیوں کے ساتھ گھٹنے گھٹنے تک اوپر اٹھی ہوئی فصلوں میں ہوا سنکی ہوئی تھی۔

آج ہر طرف فیکے کاکا کی باتیں تھیں۔ اس کے نیک بختوں اور اچھے سبھاؤ کی اور بیتی ہوئی کئی صدیوں کی نہ ختم ہونے والی باتیں۔ دراصل مرزا مغل بہادر کے جی میں جانے کیا آئی تھی کہ انہوں نے بڑی حویلی میں کاکا اور آبادی کے تمام مردوں کا کھانا کہہ دیا تھا۔ یہ بلاشبہ حیران کن بات تھی۔

فیکا، جس کی پہچان اس کے باپ کے حوالے سے نہیں، ماں کے حوالوں سے تھی۔ فیکے

نے آج تک ہر چھوٹے بڑے کے پاؤں دابے اور تلوے چاٹے تھے۔ وہ سب کے ٹکڑوں پر پلا تھا اور اس کی ماں خود کہا کرتی تھی۔

''فیکے کا خمیر بھی سب کے ٹکڑوں سے اٹھا ہے۔''

آج مرزا بہادر نے فیکے کو عزت بخشی تھی۔ آپ بہادر فیکے کے چہار بیتے سننا چاہتے تھے اور بڑی حویلی میں اس انوکھی تقریب کا خاص اہتمام کیا گیا تھا۔

مغلوں کے حجرے میں فیکے کاکا کے گرد اگرد سب جمع ہو رہے تھے اور وہ کھاٹ پر بیٹھا' سامنے کو آدھا جھکا ہوا' وقفے وقفے کے ساتھ کھانس رہا تھا۔ کسی نے اس کا موٹا خلگھلا دھو دیا تھا۔ پہلے اسے وہ پہنایا گیا' جس میں دھلنے کے بعد خاص طرح کی درشتی آ گئی تھی۔ کاکا کے چہرے اور ہاتھوں کی جھریاں کپڑے کی درشت شکنوں میں ایک ہو گئی تھیں۔ پھر کسی نے اس کے گلے میں زرد رنگ کا نیا دستر خوان باندھ دیا اور ہاتھ میں رکھنے کے لئے منقش ہاکی' جس پر پنیاں اور کوکے لگے ہوئے تھے' فیکے کاکا کے جڑے ہوئے گھٹنوں کے بیچ رکھ دی گئی۔ اوپر اس کا سفید سر دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ فیکا کاکا شکر گزار آنکھوں کے ساتھ ہر طرف دیکھا کیا۔ حویلی سے بلاوا آنے پر یہیں سے سب نے کاکا کو ساتھ لے کر آگے بڑھنا تھا۔

باہر آدھا آسمان سرخی میں رنگ گیا تھا اور بادلوں کے رنگین بجرے ایک ہی نیا لے رنگ میں یکجا ہو کر چھتری بن گئے۔ پھر حویلی کے سمت چلنے کا ''ہوکا'' ہوا...... کاکا کو اپنے جلو میں لئے ہوئے رک رک کر چلتا ہوا قافلہ آبادی سے نکل آیا۔ سامنے ایک کوس پرے' دریا کے چوڑے پاٹ کے عین کنارے پر حویلی ایستادہ تھی' جس کا شمالی کنارا بہت حد تک دریا کے کٹاؤ میں بیٹھ گیا تھا۔

بڑے دروازے پر مشعلیں روشن ہوتی گئیں۔ مشعلوں کی اڈتی ہوئی زردی میں مغلوں کا گھڑ دوڑ میدان خاموش تھا اور سنکی ہوئی ہوا قافلے کے ساتھ ساتھ دبے پاؤں چلی آئی تھی۔

فیکے کاکا کے استقبال کی خاطر' مرزا بہادر حویلی کے بڑے دروازے تک خود چل کر

آ ئے۔ تمام نگاہیں ان کے پاؤں کی کامدار جوتیوں سے اوپر نہ اٹھتی تھیں اور اوپر ''لش لش'' کرتی بھاری چادر کا گھیر تھا۔

''دشمن زیر..... خدا لمبی حیاتی دے۔'' سب وہیں ٹھہر گئے۔

پھر کامدار جوتیوں نے رہنمائی کی ہے؟

اسلحہ خانے کی دورویہ کوٹھڑیوں کی قطاروں کو عبور کر کے' اجاڑ عیش باغ کی گمنام روشوں سے ہوتا ہوا یہ قافلہ حویلی کے مردانے تک آیا' جہاں دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

کرے ہوئے کنگوروں والے فوارے کی ایک جانب دریا کی سمت کھلنے والی' بالکنی کے آگے پردا کھینچ کر مسند کے لئے جگہ بنا دی گئی تھی۔ سامنے' فوارے کے گرداگرد رعیت کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔

آپ بہادر نے لپک کر فیکے کا کا کو اپنے ساتھ مسند پر گھسیٹ لیا۔ عام لوگ سامنے نشیب میں دم سادھے ہوئے تھے۔ مرزا بہادر نے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا پھر پاٹ دار آواز میں گویا ہوئے۔

''تم سب نہیں جانتے کہ حویلی کے مردانے میں آج کتنے برسوں بعد رونق لگی ہے۔ تم نہیں جانتے کہ یہ سب کیوں ہے۔ تم یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ حصہ جہاں ہم اس وقت بیٹھے مجلس کرتے ہیں کبھی ناچ گھر ہوا کرتا تھا۔ تمہارے دائیں ہاتھ میکدے کا ملبہ ہے اور اس کے آگے دریا کی سرکش موجیں۔ اس طرف کھلے میں عیش باغ اور اس کی گمنام راہداریاں ہیں' کبھی ان راہداریوں کے نام ہوا کرتے تھے۔ فیکے کا کا نے بڑے مغلوں کی آنکھیں دیکھی ہوئی ہیں اور وہ زمانے بھی' مناسب یہی ہے کہ پہلے وہ کچھ کہیں' پھر عام روٹی ہوگی۔ کہو فیکے جو تم نے دیکھا ہے اس کے بارے میں ہم تو محض سن پائے ہیں۔''

کا کا نے کچھ کہنا چاہا اور کہتے کہتے رہ گیا۔ پھر اس نے اپنے سینے میں گہرا سانس بھرا اور بہت نحیف آواز میں گویا ہوا۔

''حضور! میں عیش باغ کی تمام گمنام راہداریوں کے نام نہیں گنوا سکتا' البتہ ان میں سے ایک گمنام میری اپنی ماں تھی۔ لوگ کہتے تھے' اس نیک بخت کے پنڈے کی کساوٹ کا چہار جانب شہرہ تھا۔ اس کے پھر تیلے انگ نے جب جوانی کی پہلی انگڑائی توڑی ہے تو خدا مغفرت کرے بڑے مرزا مغل بہادر نے اسے اکیلے میں دوسری انگڑائی نہیں لینے دی۔ اس کے پیروں کے نرم سبھاؤ اسی گھر میں اپنی معصومیت گم کر بیٹھے۔ لوگ کہتے ہیں اس وقت میری ماں صرف تیرہ برس کی تھی۔ وہ اس ناچ گھر سے عیش باغ اور خلوت کدہ سے ہوتی ہوئی گھڑ دوڑ کے وسیع میدان تک پہنچ گئی۔ مغل بہادر کی تازی گھوڑیوں نے میدان میں اتنے چکر نہیں لئے ہوں گے جتنی بار میری کمسن ماں نے رات کی تاریکی میں طویلوں اور اصطبلوں سے پلٹون سپاہیوں کی چھاؤنی تک کے چکر کاٹ لیے۔

اس کی لوریوں میں میرے لئے تھکاوٹ کا سمندر ٹھہر گیا تھا۔ سمندر جب کبھی کروٹ لیتا تو ساری کتھا بیان کرتا۔

اس روز بادل گھر کر آئے ہوئے تھے۔ دور تک اجاڑ غیر آباد میدان تھے۔ کون تھا جس نے اس لق ودق سارے میں پولی کے کانٹے بیج دیے۔ وہ یقیناً مرزا مغل بہادر نہیں تھے' میری ماں کی جوانی تھی اور اس کے بدن کی کساوٹ۔

جب کانٹوں کی فصل تیار ہوئی ہے تو جانے کہاں سے فیکا بھی کانٹوں کے ساتھ پھوٹ پڑا تھا۔ اس رات بھی زور کا مینہ برسا تھا اور فیکے کی ماں کے پیروں تلے شورہ زمین پر فیکے کی جنم گاہ' حویلی کو نکل جانے والی گزرگاہ تھی۔

ہاں تو وہ پوہ ماگھ کی کوئی ٹھٹھری ہوئی رات تھی اور گزرگاہ پر فیکا اگ آیا تھا۔ یخ' سنسناتی ہوا کو اس کی جڑوں کی تلاش تھی۔ سارے میں کہرے اور کلر کی موٹی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ چھاؤنی میں سپاہی اور طویلوں سے ملحقہ کوٹھڑیوں میں جو کی آرام کی نیند سو رہے تھے۔ فیکے کو گھٹی میں شورہ ملا تھا' سر پر نیلا آسمان اور بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں۔ فیکے کی ماں نے یخ ہوا کی

انگلی تھامی۔ ہوا جڑوں کی تلاش میں سرگرداں تھی۔

فیکا بدبخت اپنی ماں کے پیچھے طویلوں' سپاہیوں کی تاریک کوٹھڑیوں' کھیتوں اور کھلیانوں میں پنجوں ایڑیوں اور گھٹنوں کے بل چلتا رہا۔ اس کے پاؤں کے ناخن اکھڑ گئے' ایڑیاں سوج گئیں اور گھٹنوں کی ہڈیوں کے خول سرک گئے۔ جب فیکے کو ہوش آیا ہے تو طویلے کے باہر شام دھیرے دھیرے اتر رہی تھی۔ وہ ماں کو چھوڑ کر ننگ دھڑنگ دوڑتا چلا گیا۔ بڑی حویلی کے باہر مغل بابا لوگ سالھ کھیل رہے تھے۔ وہ اپنی پیدائش سے ہوا کی انگلی تھامے دوڑتا آیا تھا' حضرت صاحب کے دربار کی سمت نکل گیا۔ اس نے چھوٹے مغل بہادر جو یقیناً آپ ہی تھے' کی سالھ اپنی ہتھیلیوں پر تھام رکھی تھی۔ دربار کے سامنے کیکروں کی قطار میں سبز' سرخ اور پھولدار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ وہ ٹھہر گیا' دیر تک یخ ہوا میں جھنڈوں کی پھڑ پھڑاہٹ سنتا رہا۔ دور سے آپ بہادر نے پکارا تو دربار کی اوٹ میں ہو گیا۔ فیکا اس وقت تک وہاں بیٹھا رہا ہے' جب تک بابا لوگ اسے دربھٹ کرتے حویلی کو واپس نہ چلے گئے' پھر وہ اٹھا ہے اور اس نے کیکروں پر لہراتے ہوئے سارے جھنڈے اتار لئے ہیں۔ رنگین ریشمی کپڑوں کی نشانیاں' جن میں تانبے کے سوراخ دار پیسے' چھوٹی چھوٹی خوشیاں' امیدیں اور تمنائیں لٹک رہی تھیں' سب اس نے اتار لیں۔

اگلے روز آبادی میں جب پہلا مرغا پھڑ پھڑایا ہے' فیکے نے آنکھ کھولی۔ وہ دربار کی چوکھٹ پر جھنڈوں کے انبار تلے سیڑھیوں کے ساتھ پڑا تھا۔ اس نے شام تک وہیں بیٹھے بیٹھے کیکر کے کانٹوں سے سب جھنڈوں کو ایک کر کے اوڑھ لیا تھا۔ اس نے سوراخ دار تانبے کا ہار بنا کر گلے میں پہنا اور دربار کی سیڑھیوں کے نیچے چھپ گیا' جہاں سے اسے کئی روز بعد ماں نے بڑی مشکلوں سے باہر نکالا تھا۔

اصطبلوں' طویلوں اور سپاہیوں کی کوٹھڑیوں تک وہ ماں کے پیچھے پیچھے تھا' جھنڈے اوڑھے ہوئے اور گلے میں سوراخ دار پیسوں کے ہار کھنکھناتا۔

تم میں سے کون کون ہے' جس نے اسے چاندنی راتوں میں چمکدار سالھ کے پیچھے اکیلے دوڑتے ہوئے دیکھا ہے؟ اس نے اپنے اکھڑے ہوئے ناخن' سوجی ہوئی ایڑیوں اور گھٹنوں کے سر کے ہوئے خول کو کیکر سے اتاری ہوئی نشانیوں کے ساتھ کس کر باندھ رکھا تھا۔ چاندنی راتوں میں بنجر میدانوں پر دوڑتے ہوئے وہ ہر شے سے بے پروا' بس بڑھتا چلا جاتا تھا۔

وہ کسی جوگا نہیں تھا لیکن ہاری نواری چاروں اطراف میں لہلہاتے کھیتوں کی نگرانی کرتے کرتے اوبھ گئے تھے۔ فیکے کے پاس کوئی کام نہیں تھا' ڈھور ڈنگروں کو ڈرانے کی خاطر لہلہاتے کھیتوں کے بیچ' وہ جیتا جاگتا ''بیجا'' بن گیا۔

فیکے کو کھیتوں کے بیچوں بیچ کھڑا دیکھنے بڑے مرزا مغل بہادر خود تشریف لائے۔ اس وقت فیکے کے سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔ اس نے رنگین جھنڈوں کا گھٹنوں تک لمبا کرتا پہن رکھا تھا اور گلے میں تانبے کی مالا جھول رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو کندھوں تک اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ مغل بہادر مونچھوں میں مسکائے اور فرمایا۔

''فیکا اس بڑی سی پگڑی میں کتنا معزز دکھائی دے رہا ہے۔''

فیکا بد بخت' اسی پر خوش تھا۔ دونوں بازو پھیلائے کھڑا رہا۔ موسم گزرتے رہے اور چاروں اور لہلہاتی ہریالی میں بیچ در بیچ پگڈنڈیوں پر اس کی ساتھی ہوا گیت بنتی رہی۔ چست گائے اور کلیلیں کرتے بچھڑے کے گیت' گھڑ دوڑ کے میدان میں اترتی ہوئی رات کی کہانی' جس میں اصطبل اور طویلے سے اٹھتی' گرتی' لڑکھڑاتی بو کی بساند تھی۔

فیکے نے اکثر تپتی دوپہروں اور ٹھٹھری ہوئی طویل راتوں میں اپنی ماں کے پیچھے گھٹنوں اور پنجوں کے بل لپکتے ہوئے پیادوں اور جوکیوں کی ٹکڑیاں دیکھیں۔ لوگ کہتے ہیں محض سال بھر میں اس کسے ہوئے بدن سے نا قابل برداشت بو اٹھتی تھی' اور وہ خون تھوکتی ہوئی بیت گئی۔

فیکے کم بخت کو تو مرزا مغل کا ایک میٹھا بول پابند کئے ہوئے تھا۔ وہ ''بیجا'' بنا رہا۔ ٹھاٹھیں مارتی ہریالی کے سمندر میں دونوں بازو پھیلائے اپنے مالک کا پابند......''

فیکے کا کا کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں اور اس کی آواز دھیرے دھیرے ڈوب رہی تھی۔ وہ بیتے ہوئے زمانوں میں غوطہ لگا گیا تھا۔ اسے بے کراں وسعت کا سامنا تھا۔ وہ سارے کو گرفت میں لینا چاہتا تھا۔ اس کے سامنے ڈوبے ہوئے دخانی جہاز تھے' ٹوٹے ہوئے مستول' گہری نیلاہٹوں میں روپوش ہوتے ہوئے۔ اس کے گرداگرد بھوکی شارک مچھلیاں سنسناتے ہوئے تیروں کی مانند رواں تھیں۔ وہ لاتعداد گھونگھوں اور ناشگفتہ سیپیوں کے انبار میں دبتا چلا جارہا تھا۔

یکلخت مسند پر پلش کے گاؤ تکیے سے ٹیک لئے' فیکے کا کا نے مرزا مغل بہادر کی جانب ٹانگیں سیدھی کرلیں۔ وہ یقیناً اونگھ گیا تھا۔

مرزا بہادر کی ٹھوڑی پر پیچواں کی نے ٹھہر گئی۔ حقے کے پیندے میں پانی کی گڑگڑاہٹ نے دم سادھ لیا۔ ہر طرف گہرا سکوت تھا۔ سامنے اکڑوں بیٹھی ہوئی رعیت کا سانس سوکھنے لگا۔ پھر فیکے کا کا نے بیتے زمانوں کی گہری تہوں سے جھرجھری لی ہے۔

''خدا یہ جھوک آباد رکھے' حضور اب میں ان وقتوں کا قصہ کہتا ہوں جب فیکا جوان تھا اور اس نے مغل بیگم سرائے کے عین نیچے لہلہاتی فصلوں میں پوہ ماگھ کی طویل راتیں گزار دی تھیں۔ اس کے بازو کندھوں تک اٹھے ہوئے تھے اور چھاتی پر تانبے کا ہار ہوا میں لہریئے لے رہا تھا۔ ان طویل راتوں میں سے ایک رات کا بیان کرتا ہوں۔

اس رات حویلی کی فصیل میں عین اس جگہ روشنی کی لکیر پڑی' جہاں مغل بیگمات کی سرائے تھی۔ باہر کھلنے والی کھڑکی کے پٹ دیر تک نیم وا رہے۔ میں وہاں ٹھہرا رہا اور دیکھتا رہا۔ پھر لالٹین کی زرد روشنی دیر تک آگے پیچھے جھولتی رہی۔ یہ بلاوا کس کے لئے تھا' میں نے حیرانی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ دور دور تک ہریالی کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا جس کے درمیان یک و تنہا صرف میں ٹھہرا ہوا تھا۔

تاریکی میں جب کسی طرف سے بھی کوئی حرکت نہ ہوئی تو میں چل پڑا۔ دھیرے دھیرے نیم وا کھڑکی میں ایک ماہ لقا کا سراپا واضح ہوتا گیا۔ میں کوئی بیس قدم پہ رک گیا۔

تھا کہ حکم ہوا۔ ''اندر آ ؤ۔''

مجھ نابکار میں اتنی ہمت کہاں تھی اور پھر میرے دونوں بازو شانوں تک اوپر اٹھے ہوئے تھے۔ مترنم جھرنا پھوٹا ''بازو گرادو اور آ جاؤ۔''

میں نے ایسا ہی کیا۔ اس ماہ لقا نے کھڑکی کے پٹ بھیڑ دیئے اور کمرے کی مدہم زرد روشنی میں نہا گئی۔ ایسی روشنی میں نے ماں کے ساتھ طویلوں' اصطبلوں اور پلٹون کے سپاہیوں کی تاریک کوٹھڑیوں میں دیکھی تھی۔ ایسے میں ہمیشہ میں اس مدھم زرد روشنی میں نہائی ماں کو چھوڑ کر باہر آ جاتا تھا' کھلے میدانوں میں اکیلا سالھ کھیلتا رہتا تھا۔

وہ ماہ لقا اس زردی میں نہا رہی تھی اور میں عادت سے مجبور۔

میں پلٹا' کھڑکی کے پٹ وا کیئے اور باہر کود گیا۔ میرے گلے میں ڈھیلی پگڑی جھول رہی تھی اور تانبے کا ہار گھٹنوں پر بج رہا تھا۔ میں گھڑ دوڑ کے میدان کی طرف نکل گیا۔ پلٹون کے سپاہیوں کی کوٹھڑیاں جھانکتا پھرا۔ میں بچپن کے شناسا چہروں کی تلاش میں تھا۔ بالاخر میں اس تلاش میں کامیاب ہوا' مجھے ایک شناسا چہرہ مل ہی گیا۔ میں نے اس کھانستے ہوئے ہڈیوں کے پنجر کو اپنے کندھوں پر لادا اور بیگمات کی سرائے تک لے آیا۔ میں شاید پہلے آپ کو بتا چکا ہوں کہ وہ پوہ ماگھ کی ایک طویل رات تھی۔ کھڑکی کے پٹ اسی طرح وا تھے اور وہ اس میں نہائی' بے سدھ تھی۔ میں نے اس ہڈیوں کے پنجر کو وہاں اتارا ہے اور باہر آ گیا ہوں......''

فیکے کاکا کی آواز ایک بار پھر دھیرے دھیرے ڈوبنے لگی۔ وہ بیتی ہوئی صدیوں کی کھوج میں تھا اور اسے بے کراں وسعت کا سامنا تھا۔ مرزا مغل بہادر کی ٹھوڑی پر پیچواں کی نے ٹھہری ہوئی تھی اور چہرے پر ایک رنگ آتا اور دوسرا گزر جاتا تھا۔ سامنے نشیب میں اکڑوں بیٹھی ہوئی رعیت کے سانس ایک بار پھر سوکھ رہے تھے۔

بادلوں کے رنگین بجرے شفاف نیلے آسمان پر چھتری بنے کھڑے تھے اور باہر حویلی کی بنیادوں میں دریا پرسکون سانس لے رہا تھا۔

○

زمین جاگتی ہے

اندھیرا بڑھتا جا رہا ہے اور ہر طرف سناٹا ہے۔

''سن رہے ہو، کنویں میں سے چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے، جیسے دریا بہتا ہو۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں ایک بار پھر اندھے کنویں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں، اگر بہت جلدی بھی پہنچیں تو آدھی رات سے پہلے کیا پہنچیں گے۔''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں، ان کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھیں ہیں۔

''تو کیا تمہیں یقین ہے، انہیں دو ایسے آدمی مل جائیں گے، میرا مطلب ہے جن پر بھروسہ کیا جا سکے؟''

''اور جو بعد میں الجھیں نہیں۔'' دوسرے نے بات مکمل کر دی۔

''ہاں جو بعد میں الجھیں نہیں، مجھے تو مشکل نظر آتا ہے۔''

''اور اتنی لمبی رسی.....'' وہ بات کو نامکمل چھوڑ دیتا ہے۔

''ہاں رسی.....لیکن ہم' میرا مطلب ہے.....''

وہ آنکھ جھپکتا ہے۔

پھر دونوں تیزی سے آنکھیں جھپکتے ہیں۔

''کیا رسی اور آدمیوں کے بغیر اس میں نہیں اترا جا سکتا۔''

''وہ تو یہی کہتے تھے' پر ہم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ایسا ممکن نہیں۔''

''اور وہ رسی اور آدمی لینے چل کھڑے ہوئے۔''

دونوں ہنستے ہیں۔ پہلے کے قہقہے میں دوسرے کی آواز دب جاتی ہے اور اس کے بعد دوسرے کا قہقہہ بہت بلند ہے۔ پھر یکدم دونوں سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔

''تو پھر؟'' دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔

''لیکن یہ ہے بہت گہرا' دن کے وقت بھی پانی نظر نہیں آتا۔''

کنویں میں جھانک کر کنکرا چھالتا ہے اور دونوں ایک بار پھر منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''حیرت ہے۔''

''بس یہی تو بات ہے' جس پر دل میں ہول اٹھتا ہے۔''

''شاید گہرائی زیادہ ہونے کی وجہ سے آواز نہیں آتی۔''

''گہرائی زیادہ ہو تو' آواز زیادہ آتی ہے' چھوٹا سا کنکر بھی کھن سے بولتا ہے۔''

''تو پھر کیا بات ہے؟''

''یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔''

دونوں خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ کنویں سے مدھم مدھم آواز رک رک کر آ رہی ہے' جیسے پانی چل رہا ہو۔

''میرا خیال ہے یہ آواز پانی کی نہیں ہے۔'' پہلے نے ایک بار پھر بات چلائی۔

''پانی نہیں ہے تو بس آنا جانا ہی ہوگا۔''

''اور اگر پانی ہوا؟''

''تو کنکر پتھر آواز کیوں نہیں دیتے۔''

دوسرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

آواز مسلسل آرہی ہے۔

''پھر؟'' دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔

پہلا کوئی جواب نہیں دیتا اور کنویں میں اترنے لگتا ہے۔

''تم بھی آؤ۔ ذرا احتیاط سے' کنواں بہت پرانا ہے' پاؤں پھسل پھسل جاتا ہے۔''

''لیکن''......دوسرا اترنے میں تامل کرتا ہے۔

پہلا اب کنویں میں پھیلی سیاہی کا حصہ بن چکا ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر نظر نہیں آتا۔

''چلے آؤ۔'' پہلے کی آواز کنویں میں گونجتی ہے۔

''وہ آگئے تو......'' دوسرا بات مکمل نہیں کرتا۔

''وہ آگئے تو......وہ آگئے تو۔'' آواز کی گونج ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

دوسرا جو اس کائنات کا ایک حصہ ہے' محض ایک نقطہ......وہیں مبہوت کھڑا ہے۔

پہلا نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ بوسیدہ اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چلی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ پیر جما کر رکھ رہا ہے۔

اب کنویں میں سناٹا ہے اور صرف اس کے نیچے اترنے کی مدھم سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔

''پانی......چلنا......بند......ہوگیا۔'' کنواں اس کی آواز پر گونج اٹھتا ہے۔

یکا یک وہی آواز ایک بار پھر شروع ہوجاتی ہے۔ پانی چلنے کی آواز' جس میں پہلے کی آواز کی گونج شامل ہے۔ کچھ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔

جب دوبارہ سناٹا چھا گیا تو دوسرے نے اسے پکارا...... جواب میں اس کو اپنی آواز کی گونج:

''پانی نہیں ہے تو بس آنا جانا ہی ہوگا۔''

''اور اگر پانی ہوا؟''

''تو کنکر پتھر آواز کیوں نہیں دیتے۔''

دوسرے کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

آواز مسلسل آ رہی ہے۔

''پھر؟'' دوسرا پہلے کی طرف دیکھتا ہے۔

پہلا کوئی جواب نہیں دیتا اور کنویں میں اترنے لگتا ہے۔

''تم بھی آؤ۔ ذرا احتیاط سے' کنواں بہت پرانا ہے' پاؤں پھسل پھسل جاتا ہے۔''

''لیکن''......دوسرا اترنے میں تامل کرتا ہے۔

پہلا اب کنویں میں پھیلی سیاہی کا حصہ بن چکا ہے۔ اوپر سے دیکھنے پر نظر نہیں آتا۔

''چلے آؤ۔'' پہلے کی آواز کنویں میں گونجتی ہے۔

''وہ آ گئے تو......'' دوسرا بات مکمل نہیں کرتا۔

''وہ آ گئے تو......وہ آ گئے تو۔'' آواز کی گونج ساری کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

دوسرا جو اس کائنات کا ایک حصہ ہے' محض ایک نقطہ......وہیں مبہوت کھڑا ہے۔

پہلا نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔ بوسیدہ اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چلی ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ پیر جما کر رکھ رہا ہے۔

اب کنویں میں سناٹا ہے اور صرف اس کے نیچے اترنے کی مدہم سرسراہٹ سنائی دیتی ہے۔

''پانی......چلنا......بند......ہوگیا۔'' کنواں اس کی آواز پر گونج اٹھتا ہے۔

یکا یک وہی آواز ایک بار پھر شروع ہو جاتی ہے۔ پانی چلنے کی آواز' جس میں پہلے کی آواز کی گونج شامل ہے۔ کچھ پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا ہے۔

جب دوبارہ سناٹا چھا گیا تو دوسرے نے اسے پکارا...... جواب میں اس کو اپنی آواز کی گونج:

سنائی دیتی ہے۔ وہ اسے پکارتا چلا جاتا ہے' لیکن کوئی جواب نہیں آتا۔

رات بھیگ چلی ہے۔ اب ان کے واپس لوٹنے کا وقت قریب ہے اور پانی چلنا بند ہو گیا ہے۔

پھر وہ بھی تیزی سے نیچے اترتا چلا جاتا ہے۔

کنویں میں بہت نیچے دھول ہی دھول ہے۔ اس کا دم گھٹتا ہے۔

کچھ دیر بعد دوسرے کے پاؤں جیسے زمین سے ٹکراتے ہیں اور اس کے ہاتھوں میں پہلے کا ہاتھ آ جاتا ہے' اوپر کو اٹھا ہوا۔ کنویں کی تہہ میں چاروں اطراف دھول مٹی ہے۔ درمیان میں صرف اس کا ہاتھ ہے جو کہنیوں تک بھربھری مٹی میں دبا ہے۔

اب کنویں میں مکمل خاموشی ہے' دوسرا اوپر آنے کی سکت نہیں رکھتا اور پانی چلنے کی آواز ایک بار پھر آنے لگتی ہے۔

باہر ویسا ہی سناٹا ہے۔ وہ واپس آ رہے ہیں۔

اب وہ دو نہیں چار ہیں...... چاروں دیر تک انہیں تلاش کرتے ہیں۔ کنویں میں جھانکتے ہیں۔

تیسرے اور چوتھے کی نظریں ٹکراتی ہیں۔ پانچواں' چھٹا ان دونوں کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

''بات دراصل یہ ہے کہ ہم چار آدمی کچھ نہیں کر سکتے۔'' تیسرا ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

''ہمارے پاس رسی تو ہے ہی' بس دو اور آدمیوں کی ضرورت ہو گی۔ ہم میں سے دو کو نیچے اترنا ہو گا اور باقی چار باہر رہیں گے۔''

چوتھا بات کو مکمل کر دیتا ہے......

پانچواں اور چھٹا یک زبان ہو کر: ''جو چیز اوپر لانی ہے خاصی بھاری ہو گی۔''

وہ چپ رہتے ہیں' پھر تیسرا جیسے بات ختم کر دیتا ہے۔

''سنا تو یہی تھا' یوں بھی سونے کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔''

اب پانچواں اور چھٹا' دو قابل اعتماد آدمیوں کی تلاش میں شہر کی طرف جا رہے ہیں۔

رات دھیرے دھیرے بیت رہی ہے۔

''سن رہے ہو' کنویں میں سے چلتے پانی کی آواز آ رہی ہے' جیسے دریا بہتا ہو۔''

''لیکن کبھی ایسا دیکھا نہ سنا۔''

''ہاں کبھی نہیں۔''

دونوں کنویں کی منڈیر سے کان لگا دیتے ہیں۔

''وہ ابھی راستے میں ہوں گے۔''

''ہاں اگر بہت جلد بھی پہنچیں تو شاید صبح......''

وہ سیدھے ہو کر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں سانپ لہریئے لیتا ہے۔

○

نیند میں چلنے والا لڑکا

بڑے دن کی رات تھی۔

دریا کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلی ہوئی آبادی گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔ پچھم سے چلی ہوئی نرم قدم ہوا کا ریلا خاموش گلیوں میں دونوں طرف سے جھکے ہوئے سرکنڈوں سے سر مارتا، بین کرتا ہوا گزر رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے آبادی میں دیو پھر گیا ہو۔

پوری آبادی میں صرف ایک ہی تھا جو سوتے میں بھی ہوا کے بین سن لیا کرتا۔ اسے چاند سے ایک تعلق خاطر تھا۔ وہ اکثر راتوں میں آسمان پر رواں ستاروں کی چالیس شمار کرتا۔ وہ جاگتے میں سوتا رہتا اور سوتے میں جاگتا تھا۔

اور یہ بڑے دن کی رات تھی۔

اپنے تکیئے والے پلنگ پر وہ بے خبر سو رہا تھا کہ سوتے میں اس نے ہوا کی سسکی سنی۔ کمرے میں نیچے دری پر اس کی دو بہنیں اور ذرا ہٹ کر تخت پوش پر ماں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ برابر کے کمرے میں اس کی پھوپھیاں اور ایک چچی نواڑی پلنگوں پر جس کروٹ لیٹی تھیں، وہیں رہ گئی تھی۔

لڑکیوں کو ان کے گھر سے اٹھے ابھی کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ اس کمرے میں جہاں

وہ سو رہا تھا، کچھ ہی دیر پہلے اسے مہندی لگائی گئی تھی اور وہ لڑکیوں کے ہجوم کے درمیان بید کی کرسی پر بیٹھا رہا تھا۔

اب رات دھیرے دھیرے بیت رہی تھی اور اس کے ہر طرف نیند کا غلبہ تھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھا، جیسے سب جاگتے میں اٹھتے ہیں۔ اس نے جھک کر کھیڑیاں پہنیں اور دروازہ کھول کر صحن میں نکل آیا۔ اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ جڑ کر کھڑی بکائن میں سے زرد رو چاند نے اسے جھانکا تھا۔

وہ گہری نیند میں تھا اور اس کی آنکھیں مندھی ہوئی تھیں۔ اس کے دائیں بازو کی کلائی میں سرخ گانا جھول رہا تھا، جس پر اس نے کس کر ریشمی رومال باندھ دیا تھا۔ اس کے چمکدار لمبے سیاہ بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کے دودھیا کرتے کو خنک ہوا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی۔ وہ روتی کرلاتی ہوا کے ساتھ آبادی سے دریا کی سمت نکل آیا۔

اسے کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ اس طرح سنبھل کر چل رہا تھا، جیسے پوری طرح جاگ رہا ہو۔ پھر وہ کشتیوں والے پل پر آ گیا۔ چاند کی زردی میں مردہ رنگ کی کشتیاں تیز پانی پر ہلکورے لے رہی تھیں۔ دریا کا لشکتا ہوا پانی دور دور تک سنگین کناروں سے ٹکرا کر جھاگ اگل رہا تھا۔ وہ بہت سنبھل کر قدم رکھتا ہوا دریا پار کر گیا۔ اب وہ اس پتھریلے راستے پر ہولیا تھا، جو سیدھا مغلوں کی آبادی کو نکل جاتا ہے۔

نرم قدم ہوا اس کے پیچھے، سہج سہج چلی آئی تھی۔ سامنے پتھریلا راستہ، زرد چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ تڑخی ہوئی چٹانوں میں سے ہوتا ہوا یہ راستہ ڈھکی عبور کر کے سیدھا مغل نیکوں کی حویلی تک آتا تھا۔ حویلی کے بڑے دروازے تک جس کی اوپر اٹھتی اور پھیلتی ہوئی محرابیں دونوں جانب سرخ پتھروں کی بڑی چوکیوں پر ٹھہری ہوئی تھیں۔

بہتی ہوئی خنک ہوا چوکیوں تک اٹھ آئی تھی۔

مغلوں کے بڑے حجرے سے متصل مسجد میں ابھی کچھ دیر پہلے وضو کرنے والوں کے

قدموں کی آہٹ تھی۔ ان کے کپڑوں کی سرسراہٹ اور کلی کے گرتے ہوئے پانی کی آواز ابھی کچھ دیر پہلے صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن اب بہت تھوڑے سے وقت کے لئے دریا کی سمت سے آئی ہوئی ہوا نے سب کچھ ڈھانپ لیا تھا۔ حویلی کے گرداگرد پوری آبادی پر چاند کی خاموش زردی کھنڈی ہوئی تھی اور گلیوں میں اندھیرا لوٹیں لے رہا تھا۔

جانے کتنی دیر بعد گلی کے اس کنارے سے ملگجے اندھیرے میں راستہ بناتا' کھٹ کھٹ کرتا ممدا بہشتی ظاہر ہوا ہے۔ اس کے آگے آگے گدھے کی پشت پر خالی مشکیزے دونوں جانب جھول رہے ہیں۔ ''ہٹ' ہٹ'' کی آواز کے ساتھ گول پتھروں پر سنبھل کر قدم رکھتا' لاٹھی ٹیکتا' وہ ایک لحظہ کے لئے مسجد کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے صحن کی سن گن لی' پھر آگے بڑھ گیا۔ وہ جہاں ابھی ابھی رکا ہے' مسجد کے دروازے کے ساتھ پتھر کی بڑی سل پر پانی کی ٹینکی ٹھہری ہوئی ہے' جس کے نیچے کا خلاء باہر گلی سے درختوں کے تنوں اور جڑوں سے پر ہوتا ہے۔ ممدا اپنے اگلے پھیرے میں اس کاٹھ کباڑ کو دیا سلائی دکھا جائے گا۔

گلی کے دوسرے سرے پر' اس کے غائب ہوتے ہی مسجد سے کانپتی آواز میں فجر کی اذان ہر طرف پھیلنے کا جتن کرتی ہوئی ابھری۔ اب صرف طہارت کرنے والوں کی مدھم بھنبھناہٹ اور گرتے ہوئے پانی کا شور رہ گیا۔

بڑے حجرے کے صحن میں بے ترتیب بچھی ہوئی کھاٹوں پر چادریں تنی ہوئی ہیں۔ صحن میں چلم کی راکھ اڑی ہوئی ہے اور سامنے اصطبل اور باز والے کمرے کے درمیان' ایک قطار میں بڑے گوشت کے کٹورے آدھے آدھے زمین میں دبے ہوئے ہیں۔ ذرا ہٹ کر چاول دم ہوئے رکھے ہیں اور قریب ہی تھڑے پر گھٹنوں کو چھاتی میں دبائے شیفا نائی منہ کھولے پڑا ہے۔

یہ سب دیر تک اسی طرح رہا' پھر حویلی کا بڑا دروازہ اپنے مخصوص شور کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ جب بڑے مرزا نے کھنکار کر گلا صاف کیا ہے تو حجرے میں تنی ہوئی چادریں یکلخت سمٹی

ہیں اور شیفا نائی اٹھ کر تھڑے پر بت بن گیا ہے۔ اس وقت کھلے میں چاند اپنی زردی سمیٹ رہا تھا۔

بڑے مرزا نے ایک ہاتھ سے حجرے کی چوکھٹ کو تھام رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وضو سکھا رہے تھے۔ پھر وہ اسی طرح شکروں والی راہداری سے ہوتے ہوئے باز والی کوٹھڑی میں چلے گئے۔

گزشتہ کئی روز سے حویلی میں شادی کا ہنگام تھا۔ آج سہ پہر تک مغل برادری اور قرب و جوار کی آبادی کا کھانا نپٹانا تھا۔ برات کے پہنچنے کا وقت سہ پہر کی نماز کے بعد تھا۔ منہ اندھیرے، بڑے مرزا کی مردانے میں آمد کے ساتھ ہی حجرے میں برات کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ دالان میں جھولداریوں کے نیچے دریاں بچھا کر نیم دائرے میں تکیوں والے نواڑی پلنگوں کو جگہ دی گئی۔ بڑے مرزا سے یہ دریافت کرنا باقی تھا کہ برات کی آمد پر دولہا کے بیٹھنے اور نکاح کے لئے کون سی جگہ موزوں رہے گی، لیکن وہ باز والی کوٹھڑی میں تھے۔

مردانے میں کام کے شور کے ساتھ ہی حویلی سے ڈھولک کی گھٹی گھٹی آواز نے سر اٹھایا۔ لڑکیاں بالیاں دو ایک چھپا کے پانی کے منہ پر مارتے ہوئے پورے گھر میں ہنہناتی ہوئی پھیل گئیں۔ صبح کے ناشتے میں چائے کی بڑی بڑی نیلی کیتلیوں کے ساتھ جوار کی روٹیاں آ گئیں۔ ابھی دلہن رانی کو سنبھالنے والی سہیلیوں کی بڑی تعداد آنا باقی تھی کہ چھوٹی لڑکیوں نے ماڑی پر سے کھڑے کھڑے جرنیلی سڑک پر رنگ برنگے تانگوں کی آمد کا اعلان کر دیا۔ حویلی سے بچوں کا ایک ریلا جرنیلی سڑک کی طرف بڑھا۔ وہاں سڑک کے ساتھ ساتھ دو کوس پرے دریا کا پانی تڑپ تڑپ کر کناروں سے اوپر اٹھ رہا تھا۔

بچے پتھریلی ڈھلوان پر اٹھتے گرتے، تانگوں کی ڈھکی کی ترائی تک پہنچنے سے پہلے وہاں پہنچ گئے۔ تانگہ رکتا تو کوچوان اتر کر گھوڑی کی باگیں سامنے سے تھامے دوسری طرف منہ

پھیر کے کھڑا ہو جاتا' تانگے کے گرداگرد لپٹی ہوئی چادریں کھلتیں' زنانہ سواریاں سفید چادروں کی بکلوں میں راہ پڑ جاتیں' تب کوچوان مڑ کر تانگے کا رخ کرتا۔ چھوٹے مہمانوں کے سواگت میں مگن تھے۔

سنبھالنے والی سہیلیوں میں سے کچھ دریا پار سے بھی آ رہی تھیں۔ وہ ایک چھوٹے سے رنگین بجرے میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے' چوکڑیاں بھرتی ہرنیوں کی یہ ڈار قہقہوں کی پھلجھڑیاں چھوڑتی' ایک دوسرے کے چٹکیاں کاٹتی' جرنیلی سڑک پر آ دھمکی اور قلانچیں بھرتی دھکی پار کر گئی۔ شور کلکارا کرتے بچے ان سے بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ ہرنیوں کی اس ڈار نے حویلی کے قریب پہنچ کر وداع کے گیت میں آواز ملائی' پھر مترنم قہقہوں کا جھرنا پھوٹا۔ یکلخت بڑے مرزا تڑپ کے سامنے آئے ہیں اور حجرے سے ہی چنگھاڑ کر حکم دیا کہ زنانے کا دروازہ گرا دیا جائے۔

''کنواریوں کے یہ چالے نہیں ہیں۔'' ان کی تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ وداع کا ذکر سن کر وہ تھرتھر کانپنے لگے تھے۔ پھر وہ باز والی کوٹھڑی کی طرف مڑ گئے۔

حویلی کی فصیل پر' اندر کی عورتوں اور لڑکیوں نے چپ سادھ رکھی تھی۔ نیچے زنانے میں ڈھولک والے کمرے کی فرشی دری پر کھلے سنگھاردان کے برابر دلہن اکیلی رہ گئی تھی۔ باہر گلی میں پار سے آئی ہوئی مہمان لڑکیاں' شرم میں نہائی اپنی ایڑی کی جگہ میں ڈوب مرنا چاہتی تھیں۔ یہ ہنگامہ بہت دیر تک رہا۔

دلہن اکیلی تھی۔ وہ اپنے کمرے سے حویلی کے عقب میں کھلنے والی بالکنی میں آ بیٹھی۔ نیچے دور تک چٹانوں کی ترائی میں سبزے کی تہیں جمی ہوئی تھیں' جن کے درمیان میں پہاڑی چشموں کا شفاف پانی' ایک پتلی لکیر کی صورت چلتا تھا۔ اس نے نظر بھر کر نیچے دیکھا' پھر دستی آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگی۔

نوک والی تلے دار جوتیوں کو ڈھانپے ہوئے کلی کی شلوار' جس کی پیلی دھاریاں اوپر اٹھ

کر گا چ کی قمیص میں گم ہو گئی تھیں اور گلے میں جھمجھمی کا دو پٹہ ٹھہر نہیں رہا تھا۔ پیشانی پر دونوں طرف سنہری تعویذ، جن کے پیچھے باریک گندھی ہوئی مینڈھیوں کو کن پھولوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ناک میں ایک طرف چار گل کا پھول اور سامنے ہونٹوں پر سونے کی بلاکڑی، گلے میں سرخ گانی، کانوں میں مندرے اور مندروں تک آئی ہوئی لختئی، انگلیوں میں چاندی کے بر ہیالے، جن میں چھوٹے گھنگھرو ہر دم بے چین تھے۔ ابھی چاندی کے چوڑے، گورے بازوؤں پر لپیٹنے باقی تھے۔ اندروری پر سرخ پھمن والے بازو بند، انگوٹھوں کے چھلے اور برابر کی انگلیوں کی ستھیاں پڑی رہ گئی تھیں۔

وہ بہت دیر تک وہیں ساکت بیٹھی رہی۔ یکا یک اسے یوں لگا جیسے نیچے چٹانوں کی ترائی میں سبزے کی چادر پر کسی نے کروٹ لی ہے۔ یہ کون تھا جو اتنے بڑے ہنگامے سے کٹ کر یوں سکون کے ساتھ لیٹا تھا۔

نیچے سبزے کا گہرا سایہ تھا جس میں نرم رو ہوا اس کا دودھیا کرتا ڈھیرے ڈھیرے جھلا رہی تھی۔ اس کے چمکدار لمبے سیاہ بال شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ایک کنج میں کروٹ لئے دنیا جہان سے بے خبر تھا۔

وہ بہت دیر تک اسے تکتی رہی۔ پھر خاموشی سے اٹھ کر ڈھولک والے کمرے میں آ بیٹھی...... اب بڑے مرزا کسی طرح مان گئے تھے۔ بڑے دروازے کی کھڑکی کھلتے ہی مہمان لڑکیاں شرم میں ڈوبی، سر نیوڑھائے اندر زنانے میں کود گئیں۔ صحن اور دالان میں تخت پوش اور مسہریوں پر بیٹھی بڑی بوڑھیوں کے سر جڑے ہوئے تھے۔

''ہائے نی...... مرزا کو یوں نہیں کرنا تھا۔ کال سریوں کی آہ بڑی بری ہے۔''

''ہائی نی خوارے...... دو گھڑی ہنس بول لیا تو کیا آفت ٹوٹ پڑی تھی۔''

''نی میں کہتی ہوں، مرزا بیٹیوں کو مصلے پر بٹھائے گا۔''

دالان، کوٹھڑیوں اور ماڑی کی چوکیوں، مسہریوں اور مخملیں فرش پر ہر طرف سر جڑے

ہوئے تھے۔ دلہن کے کمرے میں سہیلیاں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئیں۔ ہر طرف مردنی چھا گئی تھی۔ مردانے میں اور حویلی کے اندر، صحن، برآمدوں اور دالان میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چار چار کوس تک کی آبادی ٹوٹ پڑی تھی۔ دونوں طرف بان کی کھاٹوں کو جوڑ کر چوکیاں بنادی گئی تھیں اور زنانے میں افراتفری مچی ہوئی تھی۔ پھر مٹی کی کوری سہنکوں میں پلاؤ اور کٹوے کے گوشت کا ورتارا شروع ہوا ہے۔ چار چار کی ٹکڑیوں میں چاولوں اور گوشت کے طباق تقسیم ہوتے گئے ہیں اور ان کے پیچھے چادروں کو تھامے ہوئے لڑکے، جن میں خمیری روٹیوں کے انبار لگے تھے۔ کھانے والوں کو پانی کے بھرے ہوئے کوزے بھول گئے۔ زنانے میں بار بار پٹتے اور روتے ہوئے بچوں کی چیخ و پکار کھانا ختم ہو جانے کے بہت بعد تک رہی۔

دونوں اطراف میں، جب ساری برادری اور چار چار کوس سے آئے ہوئے ہاری نواری کھانے سے فارغ ہوئے ہیں تو عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ ممکن ہے دریا پار، براتیوں کے گھر سے نکلنے کا ''ہوکا'' بھی ہو چکا ہو۔

جب مسجد سے موذن کی کانپتی ہوئی آواز ابھری ہے، صحن میں چارپائیاں خالی کروا کے جہیز لگا دیا گیا۔ پھر مردانے سے دلہن کے بھائی کو بلایا گیا۔ اس نے دلہن کے کمرے میں جا کر اس کی اوڑھنی کے چاروں سروں پر سات سات کچے چاول باندھ دیئے اور گردن لٹکائے باہر نکل گیا۔ سات سہاگنوں نے دعائیں دیں۔

بڑے مرزا، باز والی کوٹھڑی سے صبح کے گئے نہیں نکلے تھے۔ اس اثناء میں آپ نے صرف بودے اور کیمے کو طلب فرمایا تھا۔ جس گھڑی دونوں اپنے کاندھوں کی چادروں کے ساتھ پسینہ پونچھتے ہوئے باہر نکلے ہیں، کالا پھٹے دار سامنے ہو گیا۔

''بودے، میں نے بڑے مرزا سے پتا کرنا تھا کہ برات کی آمد پر دولہا کے بیٹھنے کے لئے کون سی جگہ موزوں رہے گی۔''

بودے نے کیمے کی طرف دیکھا۔

''ٹھپے دارا! خواہ پتہ ہو' مغلوں کی عورتیں گھروں سے باہر قدم نہیں دھرتیں۔''

اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔

''مرزے کا حکم ہے' جس طرح باز جھپٹتا ہے نا' بس اسی طرح جھپٹ پڑو۔ ہلا ٹھپے دارا ہم گئے' اب وہ آتے ہی ہوں گے۔''

کالا وہیں بیٹھ گیا۔

اب مردانے میں چھولداریوں کے نیچے لوگ ایک بار پھر یکجا ہونے لگے۔

زنانے میں' دلہن کے کمرے سے ایک بار پھر ڈھولک کی آواز ابھری تھی' سہیلیاں بڑی بے دلی کے ساتھ رقص میں دو ایک پھیرے لے کر بیٹھ رہی تھیں۔ کمرے کے ماحول میں گھٹن بڑھ رہی تھی۔ سرخ انگارہ دلہن گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ لپٹی ہوئی گوری بانہوں میں کہنیوں تک چڑھے ہوئے چاندی کے چوڑے دمک رہے تھے اور انگلیوں میں بر ہیا لے' جن کے گھنگھرو ہر دم بے چین تھے۔ اس کی نظریں اپنے پیروں کے انگوٹھوں پر تھیں' وہ آگے کو جھکی ہوئی تھی اور دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔

وہ اسی طرح چپ بیٹھی رہی تھی اور سامنے سہیلیاں بے دلی کے ساتھ پھیرے لے کر بیٹھ رہی تھیں۔ اس وقت کمرے سے ملحقہ بالکنی میں نیلا آسمان رفتہ رفتہ دھندلا رہا تھا۔ اس نے یکلخت سر اٹھایا۔

''نی...... میرے لئے وداع کا کوئی گیت نہیں گاؤ گی۔ وہ شیروں کی چھاتی والا نہیں آئے گا کیا؟'' اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔

حویلی میں ہر طرف شور مچ گیا۔ سب دلہن کے کمرے کی طرف دوڑیں۔

''ہوا کیا ہے؟'' صحن میں کسی نے پوچھا۔

''نی خوارے' اب بھی پوچھتی ہو' ہوا کیا ہے۔ برات کہیں رہ گئی ہے۔ نماشاں ہو گئیں اور دور دور تک کوئی پتا نشان نہیں۔''

اب بڑی مغلانیاں اٹھیں۔ چاندی کی بالیوں سے لدے پھندے کانوں کے پیچھے چکن کے دوپٹے اڑستی ہوئی۔

''برے' یہ کیوں نہیں سوچتے کہ خود تو شہزادی بیوی سمیت چار چار گھروں میں ڈال رکھیں' مجرے کرائیں' کوٹھوں پر جائیں اور جب بیٹیاں جوان ہوں تو ان کے بر زہر دے کر' بلوہ کرا کے اٹھوا دیں۔''

وہ ڈھیلے کانوں میں بالیوں کو جھلاتی' کولہوں پر دونوں ہاتھ ٹکائے' لڑکیوں کو سمجھاتی بجھاتی' بڑے مرزا سمیت پوری برادری کو صلواتیں سناتی' گھڑی بھر میں ہانپ کر بیٹھ گئیں۔ ہر طرف کھسر پھسر ہونے لگی۔

اس ہنگامے میں پتا ہی نہ چلا کہ کب سورج ڈوب گیا۔ برات کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہر طرف بے چینی بڑھنے لگی۔ گیس کے ہنڈے جلا کر اونچے استھانوں پر رکھ دیئے گئے۔ لڑکوں کی وہ ٹولی' جنہیں مشعلیں دے کر دریا کی سمت بھیجا گیا تھا' واپس لوٹ آئی تھی۔ برات کا پتا نشان کہیں نہیں تھا۔

زنانے میں بڑی مغلانیاں بے کل ہو کر گھومنے لگیں۔

تب سرخ انگارہ دلہن بھی اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی بالکنی تک آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سہیلیوں کا ہجوم تھا۔

نیچے تنگ گھاٹیوں میں گھپ اندھیرا گہرے سانس لے رہا تھا۔ ہریالی کے تخت پر وہ شیروں کی چھاتی والا اب تک اسی طرح سو رہا تھا۔ اس کے دودھیا کرتے کو نرم رو ہوا دھیرے دھیرے جھلا رہی تھی اور وہ ایک کنج میں کروٹ لئے دنیا جہان سے بے خبر تھا۔

○

دھوپ کا چہرہ

شام اداس ہے۔

شروع نومبر کی بلا وجہ اداس اور اکیلا کر دینے والی شام۔

کچھ دیر پہلے میں بستر پر اونگھ گیا تھا۔ نیم روشن کمرے میں لیٹے ہوئے میرا چہرہ مغرب کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب تھا۔ میں جب اٹھا ہوں تو اس سرمئی اداسی نے اپنا بھرپور وار کیا ہے۔

میرے دروازے پر گرے ہوئے سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے ہیں اور دروازے سے لپٹی ہوئی بیلیں چہار جانب سے بڑھتی چلی آتی ہیں۔

میں ایک مدت سے اس کمرے میں اکیلا ہی ہوں لیکن اس اکیلے پن میں کئی سالوں بعد ایسی ہی کوئی شام اداس کر جاتی ہے۔

ایسی شام کا کچھ ٹھیک نہیں، معمول کے دنوں میں یکا یک جانے کب اس کھڑکی تک آ جائے۔ آج پھر یہی کچھ ہوا۔

میں بستر پر اونگھ گیا تھا اور جب جاگا ہوں تو کمرے کی کھڑکی میں یہ شام جھکی ہوئی تھی۔ میں اداس اور اکیلا۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

اب میرا چہرہ اس کھڑکی میں جمی ہوئی اداس خنک شام کو چھو رہا ہے۔

باہر صحن میں کوئی نہیں اور پاگل ہوا جانے کہاں سے اتنے پتے اڑا کر لے آئی ہے' میں کھڑکی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوں۔

یہ سب بلا وجہ ہے یا محض اس وجہ سے کہ میں بستر پر اونگھ گیا تھا اور لیٹے ہوئے میرا چہرہ مغرب کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب رہ گیا تھا۔

یہ دن بھی کچھ ایسے ہیں اور وہ جنونی ہوا' جو خاموش صحن میں چکر کھا رہی ہے۔ یا ایک وجہ اور ہے۔

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب موسموں کا' گزرتے ہوئے وقت کا' اور اس جنونی ہوا کا کچھ پتا نہیں تھا...... میری ان سے شناسائی اس کھڑکی میں جھکی ہوئی شام نے کروائی ہے۔

وہ میرا لڑکپن تھا اور یہ کمرہ......

اس سامنے والے دروازے پر چق پڑی تھی اور صحن خاموش تھا' اور ایسی ہی اداسی ہر طرف کھنڈ گئی تھی۔

یہی دن تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی اور میں نے اپنے نیچے سے دوسوتی کھینچ کر اپنے شانوں پر ڈال لی تھی۔

یکا یک دروازے کی چق پر زور پڑا تھا اور جب میں نے گھوم کر دیکھا ہے تو وہ کھڑی تھی۔ اس نے اپنے دونوں بازو دروازے کی چوکھٹ تک پھیلا رکھے تھے اور چق کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

وہ بہت دنوں بعد نظر آئی تھی۔ صحن میں کوئی نہیں تھا اور میں کمرے میں اداسی کا پھیلاؤ دیکھ رہا تھا۔

''جانی' مجھے اندر بلا لو۔''

اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے آہستہ سے کہا اور میں اسے تکتا رہ گیا۔

ہم دونوں ایک مدت سے، سب سے چھپ کر گلیوں میں، دیواروں اور دروازوں کے پیچھے دن میں کئی بار ملتے رہے تھے۔

اور وہ مجھے دیکھ کر جی رہی تھی۔ یہ اس نے کہا تھا۔

وہ دیوانوں کی طرح ملتی تھی۔ بس چلی آتی تھی۔ بلا جھجک، سب سے بچ بچا کر اور میں حیران رہ جاتا تھا......

وہ حیران کر دینا جانتی تھی اور میں ہمیشہ اسے تکتا رہ جاتا۔

وہ چق کے پیچھے کھڑی تھی، ہوا کے ساتھ اس کے سوکھے سیاہ بال اڑ رہے تھے اور اس کے اٹھے ہوئے دونوں بازو دروازے کی چوکھٹ تک پھیلے ہوئے تھے۔

میں دروازے تک آیا۔

''جانی۔''

اس نے پھر کہا۔ اور اس نے اوپر اٹھے ہوئے دونوں بازو چھوڑ دیئے۔ وہ میرے گلے میں جھول گئی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ جھکا رکھا تھا اور وہ ہلکے ہلکے کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ اوپر اٹھایا...... اس کے چہرے پر، اس کے کانپتے ہوئے بازوؤں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔

''جانی، دیکھو...... اس شام کو کیا ہو گیا ہے۔''

اس کی آواز بہت دور سے آئی...... پھر اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے ہلتے رہے۔

اس شام ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی اور اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بہت دیر تک میرے دونوں شانوں سے نیچے آئی ہوئی بانہوں کے سہارے کانپتی رہی تھی، پھر اس نے کہا تھا۔

''جانی، میں چھپ جاؤں گی، تم مجھے ڈھونڈنا۔''

میں چپ کھڑا رہا تھا۔
پھر وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگی اور اس نے کہا۔
''چلو ایک دوسرے کو تلاش کریں......تم میرے دل میں چھپنا' میں تمہیں بہت جلد ڈھونڈ لوں گی۔''
میں چپ چاپ اسے تکتا رہا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں کر رہی ہے۔
وہ مجھ سے بہت چھوٹی تھی' جبکہ میں سترہ برس کا تھا......

اور وہ مجھ سے چھپ گئی۔ میں نے اسے چھپنے کو دل میں جگہ نہیں دی تھی اور باہر ڈھونڈنا بہت دشوار تھا۔
وہ کہیں اور چلی گئی تھی اور میں نے اسے ڈھونڈنا نہیں چاہا۔ میں تو بس اسے مل لیتا تھا اور اس کی باتوں کے جواب میں چپ رہتا تھا اور میرے امتحانات ہو رہے تھے۔
میں اسے بھولتا گیا' میرے دروازے پر پتوں کے ڈھیر لگتے گئے اور میں مغرب کی سمت چہرہ کئے اونگھتا رہا۔
ایک دن' جبکہ میں اسے پوری طرح بھول چکا تھا' ایسی ہی ایک شام......
میں نے آپ کو بتایا نا کہ ایسی شام کا کچھ ٹھیک نہیں۔
اس روز بھی یہی ہوا' میں بستر پر اونگھ گیا تھا اور جب آنکھ کھلی ہے تو صحن کے بچھے ہوئے پتوں پر سہج سہج قدم دھرتا' کوئی چل رہا تھا۔ پھر وہ میرے کمرے کی طرف آیا' اس وقت تک میں پوری طرح جاگ گیا تھا۔
میں نے دیکھا کہ چق کے پیچھے' ایک سایہ جھجکتا ہوا' ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھا' اور چق کے ساتھ جڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اسی طرح کھڑے کھڑے سرگوشی کی:

''مجھے پہچانا؟''

لیکن میں تو سب کچھ بھول چکا تھا۔

اور اگر میں نہیں بھولا تھا تو، جو میرے سامنے کھڑی تھی، کون تھی؟

لیکن وہ تو مجھ سے بہت چھوٹی تھی اور جو مجھ سے اتنی چھوٹی ہو اتنی جلدی بوڑھی کیسے ہو سکتی ہے۔

میں دروازے تک آیا۔

یہ جو میرے سامنے تھی، اس کے سامنے کے دانت بھی کم تھے یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسی کالی نہیں تھیں، ان میں سفیدی اتر آئی تھی۔

مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

سامنے کھڑکی میں جھکی ہوئی شام اندر بہتی ہوئی ہر طرف بھر گئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ وہ کھڑی ہوئی دھیرے دھیرے کانپ رہی ہے۔

اس کے پاؤں میں کچھ نہیں تھا۔

بس یہی دن تھے اور ہوا میں خنکی بڑھی ہوئی تھی۔

میں نے اپنے نیچے سے دوسوتی کھینچ کر اس کے شانوں پر ڈال دی۔

میں نے دیکھا کہ وہ دعائیں دے رہی ہے۔

میں نے اسے بیٹھنے کو کہا، لیکن وہ اسی طرح کھڑی کانپتی رہی۔

اس کے شانوں سے نیچے آتی ہوئی بانہیں کانپ رہی تھیں۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔

وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔

اس کی آنکھیں ویسی کالی نہیں ہیں، یا شاید وہ مجھ سے چھپ گئی تھی، تا کہ میں اسے ڈھونڈوں۔

میں نے اس سے کہا:

''کوئی بات کرو۔''

اس کے ہونٹ دیر تک کانپتے رہے پھر بولی۔''باہر بہت تیز دھوپ ہے۔''

میں اس طرف دیکھتے ہوئے کھڑکی کی جانب گھوم گیا' جہاں سے خنک شام بہتی ہوئی اندر آرہی تھی۔

''تم نے مجھے پہچانا؟''اس کی آواز دور سے آئی۔

پھر وہ اپنے شانوں سے نیچے آتی ہوئی دوسوتی سنبھالتی' مجھے دعائیں دیتی صحن میں نکل گئی۔

میں نے کہا نا کہ وہ حیران کردینا چاہتی تھی۔

صحن میں جہاں کچھ نظر نہیں آرہا' جنوبی ہوا' اسے جانے کہاں سے کھینچ لائی تھی۔

صحن میں ہوا ایک لمحے کے لئے ٹھہری اور پھر دروازے سے لپٹی ہوئی بیلوں کو احتیاط سے ہٹاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

وہ ایسی ہی ایک خنک شام تھی اور میرے دروازے پر گرتے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگ رہے تھے۔

○

سونے کی مہر

تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور تمام ناموں میں اس کا نام۔ وہ زوروں میں زور تھا اور جوانوں میں فرد۔

وہ جب گھر سے نکلا ہے تو لحہ بھر کو دہلیز پر رکا تھا۔ اس نے دروازے کو زنجیر کیا اور اپنی نئی دھلی ہوئی چادر کو اچھال کر دائیں کندھے پر جھلاتا ہوا چلا۔

اس نے اوپر نگاہ کی، اوپر بادلوں کی آوارہ ٹکڑیاں تھیں اور اس نے دیکھا کہ آسمان پر ایک طرف ساتوں رنگ یکجا ہو کر ایک قوس میں نیچے گر رہے تھے۔ پھر وہ سب سے بے پروا ہو کر چل پڑا ہے۔ اسے ہر حال میں پہنچنا تھا۔

گلیوں میں عصر کی اذان ٹھہری ہوئی تھی اور پھاگن کی نرم دھوپ ابھی کچھ دیر پہلے راہ کر گئی تھی۔ اس کے سامنے اور پیچھے دور دور تک کوئی نہیں تھا، ساری گلیاں ویران تھیں۔ اور سارے دروازے برابر۔ وہ چلتا رہا۔ گلیوں میں ہر طرف کچھ ایسی خاموشی تھی کہ جس کا سامنا اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اس نے آجڑیوں کے احاطے پر پہنچ کر اندر کی سن گن لی، وہاں کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا کہ ابھی وقت ہے کہیں رک جائے، لیکن کہاں؟ گلیوں میں کوئی نہ تھا اور سارے دروازے برابر تھے۔

ایسے میں اس کا جی اونچی آواز میں گانے کو چاہا' لیکن وہ گلیوں میں سے گزر رہا تھا۔ کچھ دیر تو وہ سر جھکائے چلتا رہا' پھر اس نے اپنا دایاں بازو اوپر اٹھایا اور ہتھیلی کو کان کے گرد ٹھہرا کر منہ پوری طرح کھول دیا۔ وہ ایک لحظہ رکا کہ شاید کوئی دروازہ کھلے' لیکن کوئی نہ آیا۔ اس کے سامنے اور پیچھے دور دور تک نرم دھوپ راہ کر گئی تھی۔

اس نے اپنی ہتھیلی اسی طرح چہرے کے ایک طرف ٹھہرائے رکھی اور پوری شدت سے چہار بیتے کا مکھڑا پہلے دائیں اور پھر بائیں مڑ مڑ کر اور ایڑیوں پر گھوم گھوم کر ادا کرتا چلا گیا۔ گلیاں اسی طرح خاموش رہیں اور وہ اپنی لہر میں نکڑ والی ہٹی کے سامنے نہیں رکا۔ اسے تو پہنچنا تھا' باہر کھلے میں' جہاں اس کی سونے کی مہر لٹکتی ہوئی بس چلی آئے گی۔

سرخ پتھروں کی ڈھکی عبور کر کے وہ اس کچی راہ پر پڑ گیا جس کے ایک طرف کیکروں کی قطار تھی اور دوسری جانب چھوٹی چھوٹی نکڑیوں میں بارش کا ٹھہرا ہوا پانی' جسے ہوا بہت آہستگی سے چھو کر گزر رہی تھی۔

وہ خود میں مگن' جھومتا اور لمبے ڈگ بھرتا چلا جا رہا تھا۔ اس کے کندھے سے ہوتی ہوئی چادر اس کے پیچھے اڑ رہی تھی اور بستی میں کوئی نہ تھا جو اسے آواز دیتا۔ اس نے پہنچنا تھا۔

تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور اسے بستی سے دو کوس باہر کھلے میدانوں تک نکل جانا تھا۔ وہ راستے میں ہی ہانپ گیا۔ وہ کھلے میں رک گیا' اس کی دائیں ہتھیلی ابھی تک کان پر جمی ہوئی تھی' اس کی نظریں ہر طرف کچھ تلاش کرتی تھیں۔ وہ اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیوں پر بار بار گھومتا' چند قدم چل کر رک جاتا اور اس کی آنکھوں میں پتلیاں پھیل سکڑ رہی تھیں۔ وہ ایک جگہ چند ساعتوں کے لئے بیٹھ بھی گیا۔

ہر طرف چپ چڑانگ تھی۔

کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ گھر سے نکلے ہی نہ؟

موسم نے بھی یکایک کروٹ لے لی ہے' ساری گلیاں یکلخت خاموش ہو گئیں۔ اس نے

سوچا۔

اب وہ خاصا متفکر نظر آنے لگا تھا۔ اس نے بیٹھ کر دونوں ہتھیلیاں اپنے گھٹنوں کے ساتھ زمین پر ٹیک دیں۔ یہاں اسے ہلکی ہلکی تھکاوٹ کا احساس بھی ہوا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو جوانوں میں فرد تھا اور زوروں میں زور۔

معمول کے دنوں میں بستی سے نکلنا اور یہاں تک آنا' پھر دریا کا چوڑا پاٹ عبور کے پار نکل جانا اور دوسرے کنارے پر دونوں ہاتھوں سے سرکنڈوں میں نئے راستے بناتے ہوئے' دائیں بائیں من کی لہر پر رقصاں رہنا اور رات گئے زقندیں بھرتے اور ماہیے کی تانیں سرکنڈوں کے سروں پر لپیٹتے ہوئے گاؤں واپس آنا' اس کا معمول تھا۔

اس نے اتنا سوچ کر دونوں ہاتھوں میں اپنے چہرے کو بھر لیا۔ وہ جو جوانوں میں فرد تھا' اس نے تن کر کھڑا ہونا چاہا' لیکن اسے سیدھے ہونے میں بہت وقت لگ گیا۔ وہ اپنے سامنے اور پیچھے لہراتی ہوئی چادر کو کانپتے ہوئے ہاتھوں سے بمشکل تمام اپنے چہرے تک لانے میں کامیاب ہوا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کے ماتھے' چہرے اور گردن کے پسینے میں چادر کی ایک طرف پوری طرح بھیگ گئی تھی۔

اب وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔

ممکن ہے وہ گھر سے اب نکلی ہو۔ اسے آنا تو ہے' اس نے کہا تھا کہ اس کا کہا پتھر پر لکیر ہے۔

وہ گم سم سا چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا' ہر طرف ڈولتا رہا۔ دور دور تک کوئی شے حرکت میں نہیں تھی' اور جب رکا ہے' تب دیر تک ہر طرف کوئی آہٹ نہیں تھی اور کھلے نیلے آسمان پر بادلوں کی متحرک ٹکڑیوں کے پیچھے ستاروں کے لشکر بڑھتے چلے آتے تھے۔

وہ میدانوں میں دھیرے دھیرے گرتا چلا گیا۔ اس کے اعضاء ڈھیلے پڑ رہے تھے۔ یکا یک اس کے شانوں سے سامنے گر کر دو ہاتھوں نے اس کی آنکھوں کو پوری طرح ڈھانپ

لیا۔ لیکن وہ تو بیٹھتا چلا جا رہا تھا' حتیٰ کہ اپنی ٹھوڑی اور کہنیوں کے سہارے ساکن ہو گیا اور اس نے ہکلا کر صرف اتنا پوچھا۔

''کون؟''

جواب میں دور تک نکل گئے میدانوں کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کلیاں چٹکیں ''بوجھو تو جانیں۔''

اس نے اپنے خالی سینے میں گہرا سانس بھرا اور خیال کیا ...... ان کلر اور کہرے میں دبے چٹیل میدانوں میں پھول بھی کھلتے ہیں کیا۔

پھر جاروں اور خود رو کاسنی پھولوں کے تختوں پر ہوا سرسرائی:

''بوجھو''

اور خوشبوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں بھر لیا۔

''مجھے دیکھو' میں ہوں تیری سونے کی مہر' اور میرا کہا پتھر پر لکیر ہے۔''

آگے کو گرے ہوئے بازو اس کے ساتھ گھوم گئے' لیکن وہ اسی طرح ٹھوڑی اور کہنیوں کے بل جھکا رہا۔ پھر اس نے دھیرے دھیرے اوپر نگاہ کی۔ اوپر اس کی پیشانی چاندی کی تختی تھی۔ اس نے مزید جھکتے ہوئے کہا:

''اس پر میں تیرا نام کیسے لکھوں۔ مجھے لکھنا نہیں آتا' تو آپ اپنا انگوٹھا ہی لگا دے۔'' پھر وہ کھلکھلا کر ہنسی اور دوہری ہو ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اس کے شانوں سے آگے کو گرتی ہوئی باریک گندھی ہوئی مینڈھیاں ایک ایک کر کے ظاہر ہوتی گئیں۔

''دیر ہو رہی تھی' میں نے سوچا تو خود انہیں سنوار لے گا۔''

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گئی اور اپنی اوڑھنی کو ایک جھٹکا دے کر سامنے لے آئی' بولی:

''میرے بازو اور کان خالی ہیں نا ...... تو ان کی طرف نہ دیکھنا۔''

اس نے اتنا سنا اور تڑپ کر اٹھا۔ بولا۔ ''تجھے گہنوں کی حاجت نہیں ...... تو سونا ہے۔''

پھر وہ اٹھا ہے اور اس نے اپنے دونوں بازو آگے کو پھیلائے ہیں۔ تب وہ اپنی اوڑھنی' گہنوں اور شانوں پر جھولتی ہوئی مینڈھیوں کو بھول کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی ہے۔
اس نے بازو اسی طرح ٹھہرائے رکھے ہیں اور چاندی کی تختی پر اپنا نام لکھنا بھول گیا ہے۔
پھر وہ سیدھا ہوا ہے اور اس نے جھولا جھلانے کے انداز میں دونوں بازو پیچھے کو لا کر آگے بڑھانا چاہے ہیں۔
ایسے میں ایک سفید براق گھوڑا اور اس پر آگے کو جھکا' واویلا کرتا ہوا سوار' ایک تیر کی طرح ان کے قریب سے گزرے۔
''شڑاپ' شڑاپ''
واویلا کرتے سوار کے دائیں ہاتھ میں تھمی ہوئی چابک گھوڑے کے دونوں جانب لہرا رہی تھی۔ رہ رہ کر آسمان سے ستارے ٹوٹتے اور وسیع میدانوں پر اس گھڑ سوار کا پیچھا کرنے لگتے۔ اس کے شور سے میدان بھر گئے۔ ایسے میں پیچھے کو آئے ہوئے بازو زور سے اوپر کو اٹھے اور دوسرے لمحے وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے بازوؤں سے نکل کر وہ پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈال فضا میں حد نظر تک اوپر اٹھتی اور لہراتی' دور نکل گئی۔
ستارے' اپنے پیچھے روشنی کی لمبی لکیریں چھوڑتے ہوئے واویلا کرتے گھڑ سوار کا پیچھا کر رہے تھے' اور اس کے دونوں بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور وہ خالی ہاتھ تھا۔ دوسرے چکر میں گھڑ سوار کی چوڑی چھاتی سے لپٹی اور اٹھے ہوئے شانوں سے لہراتی پھولوں کی ڈال اس کی نظروں میں ایک لحظہ کو ٹھہری ہوگی' پھر ہوا ہوگئی۔
وہ جوانوں میں فرداً اور زوروں میں زور جب گاؤں کی طرف نکل جانے والی بل کھاتی پگڈنڈیوں کو پلٹتا ہے تو اس نے اپنے دونوں اطراف میں ٹھہرے ہوئے پانی کی ٹکڑیوں میں' آپس میں الجھتی روشن لکیریں دیکھیں۔ اس نے دیکھا کہ باہر کوٹ کی ڈھکی کے نکڑ پر مغلوں کے حجرے میں حسب معمول لوگ بیٹھے ہنسی ٹھٹھا کر رہے ہیں۔ وہ چوروں کی طرح بکل مارے'

پھر وہ اٹھا ہے اور اس نے اپنے دونوں بازو آگے کو پھیلائے ہیں۔ تب وہ اپنی اوڑھنی' گہنوں اور شانوں پر جھولتی ہوئی مینڈھیوں کو بھول کر اس کے بازوؤں میں جھول گئی ہے۔
اس نے بازو اسی طرح ٹھہرائے رکھے ہیں اور چاندی کی تختی پر اپنا نام لکھنا بھول گیا ہے۔
پھر وہ سیدھا ہوا ہے اور اس نے جھولا جھلانے کے انداز میں دونوں بازو پیچھے کو لا کر آگے بڑھانا چاہے ہیں۔
ایسے میں ایک سفید براق گھوڑا اور اس پر آگے کو جھکا' واویلا کرتا ہوا سوار' ایک تیر کی طرح ان کے قریب سے گزرے۔
''شڑاپ' شڑاپ''
واویلا کرتے سوار کے دائیں ہاتھ میں تھمی ہوئی چابک گھوڑے کے دونوں جانب لہرا رہی تھی۔ رہ رہ کر آسمان سے ستارے ٹوٹتے اور وسیع میدانوں پر اس گھڑ سوار کا پیچھا کرنے لگتے۔ اس کے شور سے میدان بھر گئے۔ ایسے میں پیچھے کو آئے ہوئے بازو زور سے اوپر کو اٹھے اور دوسرے لمحے وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے بازوؤں سے نکل کر وہ پھولوں کی لچکتی ہوئی ڈال فضا میں حد نظر تک اوپر اٹھتی اور لہراتی' دور نکل گئی۔
ستارے' اپنے پیچھے روشنی کی لمبی لکیریں چھوڑتے ہوئے واویلا کرتے گھڑ سوار کا پیچھا کر رہے تھے' اور اس کے دونوں بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور وہ خالی ہاتھ تھا۔ دوسرے چکر میں گھڑ سوار کی چوڑی چھاتی سے لپٹی اور اٹھے ہوئے شانوں سے لہراتی پھولوں کی ڈال اس کی نظروں میں ایک لحظہ کو ٹھہری ہوگی' پھر ہوا ہوگئی۔
وہ جوانوں میں فرد اور زوروں میں زور جب گاؤں کی طرف نکل جانے والی بل کھاتی پگڈنڈیوں کو پلٹتا ہے تو اس نے اپنے دونوں اطراف میں ٹھہرے ہوئے پانی کی ٹکڑیوں میں' آپس میں الجھتی روشن لکیریں دیکھیں۔ اس نے دیکھا کہ باہر کوٹ کی ڈھکی کے نکڑ پر مغلوں کے حجرے میں حسب معمول لوگ بیٹھے ہنسی ٹھٹھا کر رہے ہیں۔ وہ چوروں کی طرح بکل مارے'

لپ ڈگ بھرتا اندر مڑ جانے والی گلی تک آیا۔

گلیوں میں بچے ابھی گھر کی دہلیزوں پر ضد کر رہے تھے اور چادروں میں ہنہناتی بیاہتا عورتوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں عشاء کی نماز سے پہلے ایک ایک دروازہ جھانکتی پھر رہی تھیں۔ یکایک سامنے سے آتے ہوئے ممدے بہشتی نے اس کا راستہ روک لیا۔

ممدے نے بتایا کہ عصر کی اذان کے ساتھ ہی وہ گھر سے نکلا تھا۔ جب اس نے دروازے کو زنجیر کیا ہے تو ممدے نے اپنے صحن سے اس کا نام لے کر پکارا تھا' لیکن وہ رکا نہیں۔ وہ تو آج بڑا لہک کر چلا تھا' سانگی استادوں کی طرح کان پر ہاتھ دھرے' گاتے ہوئے اور اپنے دائیں بائیں گزرتی زنانیوں کا راستہ روکے ہوئے۔

''اسے کیا ہو گیا ہے۔''

ممدا بہشتی حیران ہو رہا تھا اور جواب میں اس نے آنکھیں موندھے رکھی تھیں اور تھر تھر کانپتا رہا تھا۔ پھر اس کے ہونٹ دھیرے دھیرے رواں ہوئے' وہ کہہ رہا تھا:

''ممدے میں نکلا تو اکیلا تھا لیکن میرے ساتھ ستاروں کی بارات ہو لی اور میری سونے کی مہر ... پھر جانے کہاں سے واویلا کرتا ہوا اک گھڑ سوار آ گیا ہے اور ہر طرف بھگدڑ مچ گئی۔ میرے براتی اس کا پیچھا کرنے لگے۔ تجھے یقین نہیں آتا تو جا' جا کے دیکھ......''

وہ جوڑوں میں زور تھا اور جوانوں میں فرداً ایک بار پھر گھر کی دہلیز سے چند قدم پرے گلی میں بیٹھتا چلا جا رہا تھا۔

○

بُرج عقرب

دکان کے سامنے سے ہزارویں بار گزرتے ہوئے' وہ رک کر اندر کا جائزہ لیتا ہے۔

سفید بڑے گھیرے کی شلوار پر ویسا ہی کھلا کرتا اور جوگیا رنگ کی ایک چادر' دونوں کاندھوں سے سامنے کی طرف لٹکی ہوئی' نیچے بدرنگ چپل' جو آگے کی طرف نکلی ہوئی' موٹی سیاہ انگلیوں کو چھوتی ہے...... چہرے' گردن اور ہاتھوں کا رنگ سیاہ۔ سر کے بال کھچڑی۔ سفید' برف کی مانند......

نہایت ٹوٹا ہوا شخص یا نوواردِ دنیا ریا۔

میں فیصلہ نہیں کر پاتا۔

وہ چاروں سمت' شفاف شیشوں میں گھرا' دبیز قالین پر چلتا' اندر کا ماحول سونگھتا ہے اور ہمارے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے زور سے ڈکار لیتا ہے۔ سامنے اور اردگرد شوکیس کے شیشے اس کا عکس ایک دوسرے کو منتقل کرتے ہیں۔ بے شمار ٹکڑوں میں بٹ کر وہ بے چین ہے' پہلو بدلتا ہے۔

ہم دونوں سوالیہ نشان' اسے گھورتے ہیں اور بات کی ابتداء کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی تلاش میں اسے گمراہ کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"آپ اجازت دیں تو میں یہاں تے کراوں۔"

ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔

"یہ میری مجبوری ہے۔"

وہ اطمینان سے سامنے رکھے شوکیس پہ دونوں کہنیاں ٹکا کر گردن جھکا لیتا ہے۔ سرخ قیمتی قالین پہ تے کرتا ہے۔

جگمگ کرتے زیورات کا شیشہ تے کے چھینٹے پڑنے سے دھندلا جاتا ہے۔

میرا ساتھی دوڑ کر مکمل شیشے کے بنے دروازے کی چٹخنی اندر سے لگا دیتا ہے اور Closed کا بورڈ باہر الٹتا ہے۔

"بو باہر نہیں جانی چاہیے۔"

وہ شوکیس پہ جھکا سانس درست کرتا ہے۔ اس کے بے طرح بڑھے ہوئے سوکھے بال' میلے کرتے کے کالر پہ پڑے ہیں۔

سفید رنگ کے کرتے سے اس کے بال زیادہ اجلے ہیں اور نیچے کالی گردن ... میں جلدی سے غلاظت پہ گلابی رنگ کا گدی پیپر ڈال دیتا ہوں اور قالین کے اس حصے کو احتیاط سے کاٹ اور چمٹی کے ساتھ الگ کرتا ہوں۔

"ارے کوئی ہے؟"

میرا ساتھی گلا پھاڑ کر سائیڈ روم کی طرف دیکھتا ہے۔

دروازہ کھلتا ہے۔

"سب کو اندر بلاؤ۔"

وہ شوکیس کا سہارا لیئے' آستین سے ماتھے کا پسینہ پونچھتا ہے۔

ہماری نظریں اس کی کرسی کے نیچے فرش پر رکھے پرانے چوبی بکس پر جمی ہیں۔

"راز اس وقت تک راز رہتا ہے جب دوسرے تک نہ پہنچے۔ بہرحال......" اپنے

خدشات کا اظہار کرتے ہوئے' کرتے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر بڑے نوٹوں کی ایک گڈی سامنے شوکیس پر رکھتا ہے...... ہماری طرف کھسکاتا ہے۔

''کام بہت مہارت کا ہے۔''

''بے فکر رہئے۔''

ہم دونوں بھی کاریگروں کی آواز میں آواز ملاتے ہیں۔

''دراصل وقت کم رہ گیا ہے۔ میں نے بھی کام بہت مشکل سے مکمل کیا' اب صرف تین روز ہیں آپ کے لئے۔''

وہ جھک کر لکڑی کا بکس اٹھاتا ہے اور سامنے کے شوکیس پر رکھ دیتا ہے۔

''یہ جو عبارت اس پر درج ہے۔''

اس کا اشارہ چوبی بکس کے ڈھکنے پر ابھری جناتی زبان کی طرف ہے۔

''اب اس کی ضرورت بالکل نہیں۔ بس سونے میں کھوٹ اور اس کے سائز میں فرق نہیں ہونا چاہیے۔''

کاریگر نہایت احتیاط سے فیتے کے ساتھ خستہ چوبی بکس کے ایک ایک حصے کا ناپ کاغذ پر منتقل کرتے ہیں۔

وہ کرتے کے نیچے سے ہاتھ ڈال کر نوٹوں کی دوسری گڈی پہلی کے اوپر رکھتا ہے۔

''اب اسے کھولنا ہوگا' جناب اندر سے......''

کاریگر یک زبان ہو کر منمناتے ہیں۔

''دراصل بکس کے ساتھ آپ نے بالکل اس جیسا' اسی طرح کا' اسی وزن کا......'' وہ ڈھکنا الٹتا ہے۔ بکس کے اندر شیشہ جڑا ہے۔ نیچے بہت بڑا سیاہ بچھو تیز روشنی سے پریشان ہو کر اپنا ڈنک زور زور سے لہراتا ہے' وار کرتا ہے۔ شیشے کی نچلی سطح اس کے زہر سے پیلی پڑ گئی ہے۔''

''معاف کیجئے' میں آپ کو اس کے متعلق بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔''

''کوئی بات نہیں۔''

میں نیچے کا سانس اوپر اور وہ اوپر کا سانس نیچے بھیجتا ہے۔

بچھو چاروں طرف وار کرتا ہے۔

وہ بکس پر جھکا' گردن گھما کر ارد گرد کھڑے کاریگروں پر نگاہ کرتا ہے' جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ وہ اپنا سانس درست کرتے ہوئے اس کا ایک ایک لفظ نوٹ کرتے ہیں۔

''بالکل اس جیسا' اسی طرح' اسی وزن کا بچھو...... بس کھوٹ نہیں ہونی چاہیے۔''

وہ ہماری طرف دیکھتا ہے۔

''ورنہ مجھے معاہدہ مجبوراً توڑنا پڑے گا۔''

ہماری زبانیں گنگ ہیں۔ جواب چہرے کا اتار چڑھاؤ اور آنکھیں دیتی ہیں۔

وہ مطمئن ہو کر کرسی پر جسم ڈھیلا چھوڑ دیتا ہے۔

تمام کاریگر شیشے پر جھکے ہیں۔ شیشے کے نیچے تنگ جگہ میں بچھو تیزی سے حرکت کرتا ہے۔

''......اس کا وزن غیر معمولی حد تک بڑھ گیا ہے۔ ذرا کاغذ پنسل عنایت کیجئے۔'' وہ کاغذ پر پنسل سے جلدی جلدی چوبی بکس کے ڈھکنے پر لکھی جناتی زبان سے بھی آگے کی تحریر درج کرتا ہے۔

کاریگر مختلف زاویوں سے ناپ لیتے ہیں۔

''دو سال پہلے جس گوبر سے اسے پیدا کیا تھا' اس کا وزن آٹھ تولے تھا۔ اس حساب سے ہر روز کا اضافہ......زہر کا اخراج......''

کاغذ پر حساب لگاتا ہے۔

''یہ لیجئے' وزن میں فرق نہیں پڑنا چاہیے......''

تمام کاریگر گڈی کاغذ میں لپٹے راز کو سائڈ روم میں منتقل کرتے ہیں۔

''پرسوں شام' حاضر ہوں گا۔امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔''

وہ چوبی بکس کو سنبھال کر مسکراتا ہے اور اپنے گھر کا پتا کاغذ پر لکھ کر ہمارے حوالے کرتا ہے۔

ہم دونوں بتیسیاں نکالے اسے باہر تک چھوڑنے جاتے ہیں اور پلٹ کر سائڈ روم میں کاریگروں کے ساتھ پیانہ' جمور' ہتھوڑی' آری' باکنال اور کات سمیٹ کر چمکنی اور جندری پہ جٹ جاتے ہیں۔ ہمارے ہاتھوں کی جلد جین پیپر ہے۔

دو روز بعد ٹھیک وقت پر وہ آتا ہے۔دونوں چیزوں کی پڑتال کر کے تمام معاوضہ ادا کرتا ہے اور سونے کے نئے چمکدار بکس میں سنہری بچھو کو رکھ کر بکس بطور امانت' دکان ہی میں چھوڑ جاتا ہے۔

اگلے روز پھر اس کے آنے کا وعدہ ہے۔

دوسرے دن ٹھیک وقت پر آ کر سنہری بکس کا ڈھکنا کھولتا ہے۔اب اس میں بالکل ایک طرح کے دو سنہری بچھو اوپر تلے موجود ہیں.....نر اور مادہ۔

''خدا کی قدرت ہے۔اس نے ہر چیز کا جوڑا بنایا ہے۔'' وہ کہتا ہے۔

ہمارے پیر زمین کو تلاش کرتے ہیں۔ہم ہوا میں معلق' شوکیس کا سہارا لے کر اپنا توازن برقرار رکھتے ہیں۔

وہ اوپر والے نر کو نکال کر اپنے تھیلے میں رکھتا ہے اور بکس بطور امانت رکھواتا ہے۔

ایک عرصے سے اس کا معمول ہے کہ ٹھیک وقت پر آ کر بکس میں سے نر بچھو نکال لے جائے۔ہم دونوں نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ بکس کا ڈھکنا کھول کر صرف ایک بچھو کی خیانت کیوں کی جائے۔

ہماری بھری پری دکان کا سودا طے پا چکا ہے۔دکان کے نئے مالک سائڈ روم میں موجود

ہیں۔ آج وہ آئے گا اور اس کے جانے کے بعد ہم دکان کو ہمیشہ کے لئے خیر باد کہہ دیں گے۔

ہم دونوں کی نظریں وال کلاک سے دروازے تک گردش کرتی ہیں۔

''معاف کیجئے۔''

اس کا پہلا قدم اندر پڑتا ہے۔

''کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔''

ہم دونوں کے دل کی حرکت رکتی جاتی ہے۔

میں الماری کھول کر آرام سے بکس اس کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔ وہ اپنا کام کرتا ہے اور حسب معمول معذرت کرتا ہوا باہر نکل جاتا ہے۔

باہر بھیڑ میں بہت دیر تک ہماری نظریں اس کا تعاقب کرتی ہیں' جہاں وہ غائب ہوا ہے۔ میں جلدی سے شوکیس پر رکھے سنہری بکس پر سفید چادر ڈال دیتا ہوں۔ دکان کے نئے مالکوں سے آخری ملاقات کے بعد ہم سفید چادر میں لپٹے بکس کو سنبھالے باہر آتے ہیں۔ دونوں کے قدم ٹھیک طرح نہیں پڑتے۔ میں لوگوں کے ہجوم میں چلتے ہوئے خود کو بالکل ننگا محسوس کرتا ہوں۔ ہمارا رخ چار روز پہلے لئے فلیٹ کی طرف ہے' جہاں سے اگلے روز تجربہ کامیاب ہوتے ہی' کہیں دور نکل جاتا ہے۔

یہ رات میں نے جاگ کر گزاری ہے۔

مجھے اپنے ساتھی پر شک ہے...... بلکہ پورا یقین ہے کہ......

اس لئے احتیاطاً میری پتلون کی جیب میں ریوالور ہے' مجھے کچھ پتا نہیں وہ میرے متعلق کیا سوچتا ہے۔

میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس نے بھی رات جاگ کر گزاری ہے۔ ہر لمحہ مجھے یوں لگا جیسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری نگرانی کرتا رہا ہے۔

اب ہم دونوں کے درمیان میز پر بکس رکھا ہے۔

ہمارا اپنی کلائی کی گھڑیوں پر سے ایمان اٹھ چکا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میری گھڑی پورے پندرہ منٹ لیٹ جارہی ہے۔ وہ اپنی گھڑی کے تیس منٹ لیٹ ہو جانے کی شکایت کرتا ہے۔

''یہ آخری سگریٹ پی کر اسے کھول دیں گے۔''

میں اسے سگریٹ پیش کرتا ہوں اور سگریٹ کے آخری کش لیتے ہوئے میں رومر اور فیورلیو بانانے والوں کی ماؤں بہنوں کے ساتھ اسے سلاتا ہوں۔

وہ مسکرا کر بکس کا ڈھکنا الٹ دیتا ہے۔

''اس کی ماں کی......''

اب وہ گالیاں لوٹاتا ہے۔ کچھ اس کی طرف کچھ میری طرف......

میں مادہ کو الٹتا پلٹتا ہوں۔ پھر وہ تسلی کرتا ہے۔

ہمارے چہرے لٹک کر چھاتیوں پر جھول جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے گردن جڑ سے نکل جائے گی اور نیچے فرش پر ہمارا بھیجا ایک دوسرے کے بھیجے میں رل مل جائے گا۔ ہم گذشتہ سات روز سے بغیر کھائے پیئے ہر پانچ منٹ بعد بکس کا ڈھکنا کھولتے ہیں اور اس میں صرف مادہ بچھو پاتے ہیں۔

''اس کی طرف چلنا چاہیے۔''

وہ سفید چادر میں بکس کو چھپاتے ہوئے میرے منہ کی بات اچکتا ہے۔

رات کا آخری پہر ہے۔

ضعف سے قدم نہیں اٹھتا۔

ہم چلتے ہیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آجاتا ہے۔

اندھیرے میں دونوں اکھڑی ہوئی اینٹوں کی گلی میں اس کا مکان تلاش کرتے ہیں۔

پرانا بے رنگ دروازہ اندر سے بند ہے۔ میں کواڑ کی درز سے اندر جھانکتا ہوں' جہاں اندھیرا ہے۔

سنسان گلی میں ہم لپک کر پائپ کے سہارے دیوار پر چڑھتے ہیں اور اندر کود جاتے ہیں۔

صحن ویران ہے۔ سامنے کے کمرے سے ہوتے ہوئے ہم احتیاط سے آگے بڑھتے ہیں۔ اس وقت سفید چادر میں لپٹا سنہری بکس اس کے پاس ہے۔

کمرے کے اندر ایک دروازہ اور کھلتا ہے۔ یہ دوسرا کمرہ ہے۔ اندھیرے میں ہم ایک دوسرے سے خوف کھاتے ہیں۔ میرا ہاتھ پتلون کی جیب میں ہے۔

وہ دیا سلائی جلاتا ہے۔

کمرہ بالکل خالی ہے۔ بغیر قلعی کی دیواروں پر بہت دھندلی عجیب وغریب تصاویر ہیں۔ دائیں ہاتھ ایک کھڑکی ہے جس کے پٹ ہماری طرف کھلتے ہیں۔

اس طرف سے بدبو کی لہر آتی ہے۔ میں سانس روکے' دوسری طرف دیا سلائی سے روشن کرتا ہوں۔

کمرے کا فرش بہت نیچے ہے' نظر کام نہیں کرتی۔

ہم اسے پکارتے ہیں۔

جواب میں کمرہ اس کا نام دہراتا ہے۔

بدبو اس کمرے کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔

وہ بڑھ کر کھڑکی کے پٹ بند کر دیتا ہے۔

دیر بعد ہمت کر کے ہم دونوں دوسری طرف اندھیرے میں کود جاتے ہیں۔ کمرے میں اس قدر تعفن ہے کہ ہم اپنی سانس گھٹتی محسوس کرتے ہیں۔ وہ کھڑکی جس سے ہم کود کر یہاں پہنچے ہیں بہت اونچائی پر ہے۔ سامنے گدے والی چارپائی کے ساتھ نیچے فرش پر اس کی لاش

اوندھے منہ پڑی ہے۔ ایک طرف پرانا چوبی بکس کھلا ہے، جس کے اوپر شیشہ موجود نہیں۔

اس کا گوشت جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے اور ایک زرد رنگ کا سیال فرش پر پپڑی بنا رہا ہے۔

دیا سلائی کی روشنی میں میرے ساتھی کو میز پر اس کی آخری تحریر ملی ہے۔ جس میں وہ ہم سے ہی مخاطب ہے۔

اس نے لکھا ہے۔ ''یہ عمل کرنے کا موقع صدیوں بعد آتا ہے۔ جب زہرہ اور شمس، زمین سے ایک خاص فاصلے پر ہوتے ہیں۔ عمل کے بگاڑ کے بعد دوسرا موقع اب پورے ستر سال بعد آئے گا۔ ہمارے یہاں آدمی کی اوسط عمر...... اس لئے جینے کا فائدہ؟''

سوالیہ نشان پھیل کر ہمیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ہم اس وقت کمرے میں آتش دان کے اوپر مینٹل پیس پر اکڑوں بیٹھے ہیں۔ دیا سلائی کی خالی ڈبیہ میرے ہاتھ میں ہے۔ میرے ساتھی کا خیال ہے کہ چوبی بکس کا بچھو فرش پر ہمیں تلاش کر رہا ہے۔

○

سرسوتی اور راج ہنس

ویروار، ماگھ کی پانچ تاریخ ہے اور راکھشس بیلا۔

رات کا پہلا پہر ہے، چاروں کھونٹ اندھیرا۔ ہم سب برہماوت کے اجاڑ، غیر آباد، لق و دق دور تک پھیلے میدان میں اکٹھے ہوئے ہیں۔

دور تک پھیلے میدان میں بڑھتی ہوئی خنک تاریکی، فضا پر چھائے ہوئے روحانی تقدس میں شدت پیدا کرتی ہے۔ چاروں اور عقیدت مندوں کے پرے حرکت کر رہے ہیں۔ اگر، لوبان اور عود کی اٹھتی ہوئی لپٹیں اس ویرانے کے گرد پھیلے ہوئے دریائے سرسوتی اور درشدوتی کے گھیرے کو توڑتی ہوئی چاروں اور پھیلتی ہوئی منتشر ہوتی ہیں۔

''برہم راشی میں ہے کہ برہما اپنے چاہنے والوں کا امتحان لیتے ہیں۔''

ہجوم کے درمیان، قدیم ڈھیتی ہوئی دیوار پر بنائے اونچے استھان پر بیٹھا بریست برہما پر اُن کا ورد کر رہا ہے۔ اس کی آواز ہوا کے دوش پر ہجوم کی سرگوشیوں میں ڈوبتی ابھرتی ہے۔

چاند دھیرے دھیرے، احاطے میں ایستادہ پیپل کی شاخوں سے الجھتا ہوا اوپر اٹھتا ہے۔ سارے میں اگر، لوبان اور عود کی ملی جلی خوشبو گاڑھی دھند کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ سرسوتی، پیپل کے نیچے خوشبو کی دھند میں بے حس و حرکت چاند کو اوپر اٹھتا دیکھتی رہتی ہے۔

اس کا بائیں شانے تک اٹھا ہوا دایاں ہاتھ' سفید براق ساڑھی کے ڈھلکتے ہوئے پلو کے ساتھ' چاند کی رفتار سے بھی آہستہ' بہت آہستہ نیچے گرتا ہے۔

ہم سب اپنے سینوں پر ہاتھ جوڑے دھیرے دھیرے جیسے خواب میں چل رہے ہوں اور برہما پران کے خستہ اوراق تیز خنک ہوا سے اڑتے' چاروں اور بکھر جاتے ہیں۔

سب کے سروں پر' اونچی استھان پر بیٹھے برہیست کی آواز بہت واضح ہو جاتی ہے۔

''برہم راشی میں لکھا ہے کہ اس نے ایسے ہی میں لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس گھڑی کیلاس پربت کو سدھارتے سمے' اسی جگہ' اس کھلے میں انار کے ارغوانی پھولوں سے اٹھتی مہک کی گاڑھی دھند میں ڈوبے' سرسوتی کے دونوں ہات تھام کر برہما نے اوپر اٹھتے ہوئے چاند کو گواہ ٹھہرایا تھا۔ ترت لوٹ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ تب یہ ویرانہ سرسبز و شاداب تھا۔

پھر جب انار کے پیڑ مہکے اور چاند' خوشبو کی گاڑھی دھند سے اوپر اٹھا' وہ برہ کی ماری کھلے میں بے حس و حرکت' چاند کو اوپر اٹھتا دیکھتی رہی' دیکھتی رہی۔''

برہیست پڑھتے پڑھتے رک کر اپنی سانس درست کرتا ہے۔

سامنے اٹھتی ہوئی خوشبو کی لپٹوں میں' اٹھا ہوا ہاتھ' چاند کی رفتار سے بھی آہستہ نیچے گرتا ہے۔

برہیست کہتا ہے۔ ''برہما تو ...... روح مجرد ہے' اس مجبور سے کیا وعدہ نبھا۔''

اور وہ دھیرے دھیرے چاند کی اور بڑھتے ہوئے اپنی مسحور کن آواز سے ہم پر جادو کرتی ہے۔ پھر اس کی مترنم مدھر آواز کی دور ہوتی لہروں سے برہیست کی آواز ابھرتی ہے۔

''اور پہلے ہی روز ...... برہما پران میں ہے کہ اوپر آکاش کی بے پناہ وسعتوں سے طویل مسافت کے بعد تھکے ہارے اکیلے راج ہنس نے مزید سفر کا ارادہ ترک کیا اور اس غم زدہ' چاروں اور پھیلتی ہوئی التجا کو سن کر نیچے' انار کے مہکے ہوئے پیڑوں کی لمبی قطار کی طرف چلا آیا۔ اس نے اونچی دیواروں کے احاطے میں پھیلی خوشبو کی گاڑھی دھند پر کئی چکر لگائے

اور جب چاند ڈوب گیا اور وہ برہم چپ ہوگئی تو راج ہنس نے اوپر اٹھتے ہوئے اپنی سرخ چونچ سے کوئی بہت ہلکی، روشن، لشکتی ہوئی شے نیچے گرائی اور غائب ہوگیا۔''

پھر جب جب انار کے پیڑ مہکے، وہ ہجر کا گیت سننے لمبی مسافت طے کرتا، خوشبو کی گاڑھی دھند تک ضرور آیا۔ چاند کے زوال تک مہکے ہوئے پیڑوں پر چکر کاٹتا رہا اور جب وہ چپ ہو جاتی تو اوپر آکاش کی طرف اٹھتے ہوئے کوئی بہت ہلکی، روشن، لشکتی ہوئی شے نیچے گراتے ہوئے وسعتوں میں گم ہو جاتا۔

سرسوتی، اس دور دیس کے تحفے کو ایک مٹکے میں ڈال دیتی۔ برہم راشی میں ہے کہ پیڑ مہکتے رہے اور چاند ڈوب کر ابھرتا رہا اور وہ برہم فراق کے گیت گاتی رہی۔

آنے والا، اس وقت لوٹا جب دونوں کے بالوں میں چاندی اتر آئی۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ چاروں کھونٹ اندھیرا۔

منتظر آنکھوں کا شیشہ دھندلا گیا۔ آنے والے کے گرد سے اٹے ہوئے چہرے پر تھکن، شک اور بدگمانی کی پرچھائیاں تھیں اور ہتھیلی پر کوئی بہت ہلکی، روشن، لشکتی ہوئی شے۔

سرسوتی نے دو زانو ہو کر برہما کی جگمگاتی ہتھیلی کی روشنی میں ہاتھ جوڑ دیئے۔ آنکھوں سے ساون کی جھڑی لگی تھی۔

''میرے مالک، مجھے اس کی نہیں، تیری ضرورت ہے۔''

برہم نے اسی طرح پھیلی ہوئی ہتھیلی پر اس بہت ہلکی، روشن، لشکتی ہوئی شے کو سنبھالے رکھا۔

''مجھے اس کی نہیں تیری ضرورت ہے، برہما...... یہ دیکھو میرے پاس......'' اور اس نے سامنے، قدموں میں مٹکا الٹ دیا۔ نور کا ایک سیلاب آ گیا اور پھیلی ہوئی ہتھیلی پر سے وہ لشکتی ہوئی شے لڑھک گئی۔

برہم کے چہرے سے گرد دھل گئی اور شک رہ گیا۔ اور برہم راشی میں ہے کہ وہ انہی

قدموں لوٹ گیا۔

رات کا دوسرا پہر تھا۔ چاروں کھونٹ اندھیرا۔

چاند دھیرے دھیرے پیپل کی شاخوں سے الجھتا ہوا اوپر اٹھا اور خوشبو کی گاڑھی دھند میں وہ بے حس و حرکت، چاند کو اوپر اٹھتا دیکھتی رہی۔

آج ہجر کے گیت کی اتم سرتھی۔

چاند کے ڈوبتے ہی، ملگجے اندھیرے میں ایک سایہ اوپر کو اٹھا، نیلے آکاش کی جانب......

برہما کی تنی ہوئی کمان کے چلّے پر چڑھا تیر نکل گیا۔

ایک دلدوز چیخ، پیپل کی شاخوں سے الجھتی، گہری دھند میں ہر طرف پھیلی ہریالی میں گر کر ٹوٹ گئی۔

اب رات کا آخری پہر ہے۔

برہما، دھیرے دھیرے چلتے ہوئے وہاں تک آتے ہیں جہاں راج ہنس نے سرسوتی کے ہاتھوں میں آخری سانس لئے ہیں۔

○

آخرگت

''ہماری ملاقات کہیں بھی ہو سکتی ہے' چائے خانے میں' مصروف سڑک پر' ریلوے اسٹیشن یا...... یہاں' اس جگہ......''

ہر طرف سے لوگوں میں گھرا' توانا جثے کا نوجوان اپنے ستے ہوئے چہرے کو کالی چادر سے ڈھانپ کر سسکتا ہے۔

بے ترتیب انگوٹھیوں میں جڑا ہلکا گلابی' ترشا ہوا نیلم' سامنے سے پڑتی روشنی میں ہماری آنکھیں خیرہ کرتا ہے۔

''اگر تو سن رہا ہے تو خدا کے لئے میرا نام لے کر بلا۔ میں تیرا کتّا' قدموں کی خاک' بہت تنگ ہوں' مرنا چاہتا ہوں۔''

آنسوؤں سے تر' کالی چادر کے پیچھے سِکیاں لیتا ہے۔

''کتا' قدموں کی خاک......''

اس کے الفاظ' رونے کی آواز میں اپنا مفہوم کھو دیتے ہیں۔

وہ عمر رسیدہ سفید پوش' جن کے سر اور بھوؤں کے بال خالص چاندی ہیں' اس کے قدموں میں بیٹھے' کپکپاتے ہاتھوں سے اسے تھام کر تسلیاں دیتے ہیں۔

سننے والوں نے سنا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ وہ دونوں قبر میں پاؤں لٹکائے' عمر رسیدہ سفید پوش اس کالی چادر میں منہ چھپائے' توانا نوجوان کو اپنا باپ کہہ رہے تھے۔

حیران لوگوں کا ہجوم' منہ کھولے ...... سن کھڑا' تماشا کرتا ہے۔

وہ چہرے سے چادر ہٹا کر' سرخ آنکھوں سے چاروں سمت ملتجانہ نظروں سے تکتا ہے۔

ہم آپس میں رلے ملے بے چہرہ' بدشکل' آندھل جنسی مریض' بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

''دیکھ میں رل گیا' میرے سامنے میرے بچے بوڑھے ہو گئے۔ اب میں مرنا چاہتا ہوں کہ یہ میری چارپائی کو کندھا دیں۔''

وہ دونوں اثبات میں اپنی گردنیں ہلاتے ہیں۔

''دیکھ میں نے چالیس سال تیرا گوموت کیا۔ یاد کر۔ مجھے عمل کا توڑ بتا' میں تیرا کتا' قدموں کی خاک''اونچی ہوتی ہچکیوں میں ایک بار پھر اس کی بات پلے نہیں پڑتی۔

سامنے' دائیں بائیں بیٹھے نہایت مودب' سفید پوش بزرگ ایک بار پھر مضطرب ہوتے ہیں' تسلیاں دیتے ہیں۔

میں گلے کے گرد لپٹی چادر سے اپنے آدھے چہرے کو چھپاتا ہوں۔ ہم آگے پیچھے جڑ کر کھڑے ہوئے ایک دوسرے کے ہپ پاکٹ ٹٹولتے' پتلونوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر سکون پاتے ہیں' ان تینوں باپ بیٹوں کے گرد گھیرا تنگ کرتے ہیں۔

''ہماری ملاقات کہیں بھی ہو سکتی ہے۔ چائے خانے میں مصروف سڑک پر' ریلوے اسٹیشن یا ...... یہاں' اس جگہ۔''

کھنکار کر گلا صاف کرتا ہے۔ اس کے منہ سے کالی زبان' خشک ہونٹوں تک آتی ہے۔ انہیں تر کرتی ہے۔

''دیکھ' مجھے یہ کہانی سناتے پورے ساٹھ سال بیت گئے۔ چالیس سال تیری خدمت کی' اب ...... تجھے ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ جہاں جاتا ہوں یہ کہانی سناتا ہوں کہ تجھ سے میل ہو اور

میری مشکل آسان ہو۔ میں تیرا کتا' قدموں کی خاک...... میرے بیٹو میں تم سے مخاطب ہوں۔''

اب اس کے مخاطب ہم سب ہیں۔

میرے بالکل سامنے اور دائیں بائیں کھڑے لوگوں کا ہجوم' دم بخود ایک ایک لفظ غور سے سنتا ہے' وہ کہتا ہے۔

''میرے کالے بالوں پر نہ جاؤ' یہ میرے خدمت گزار میرے ہی نطفے سے ہیں۔''

وہ دونوں' جنہیں وہ اپنے حقیقی بیٹے کہتا ہے' نہایت ادب سے' جیسے اس کے سامنے صف درست کرتے ہیں۔ حد سے تجاوز کیا ہوا رعشہ دونوں کے ہاتھوں کو زانو پر ٹکنے نہیں دیتا۔

''دیکھو یہ سب ناقابل یقین' میرے پیر و مرشد کا کیا دھرا ہے' جسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے......''

گہرا سانس لیتا ہے۔

''اس سے آخری ملاقات کو آج پوری ایک صدی مکمل ہو رہی ہے' جوں ہی پو پھٹے گی' سو سال مکمل ہو جائیں گے۔ میں نے آج کی رات کے لئے دن گنے ہیں۔ میرے حساب کے مطابق آج پو پھٹنے پر...... نئے چاند کے ساتھ نحس اثرات کا خاتمہ ہوگا۔ آج رات کے خاتمے پر' اسے بھی اس مقام پر ہونا چاہیے۔ وہ یقیناً تم میں سے ایک ہوگا۔ میں مرشد کے پیر پکڑنا چاہتا ہوں۔ اسے توڑ بتانا ہوگا' تب میری مشکل آسان ہوگی' میں مر سکوں گا۔ لو سنو' پوری کہانی ایک بار پھر کہتا ہوں۔

اسی جگہ' یہ پوری ایک صدی پہلے کی بات ہے' میں پہلی بار مرشد کے پاؤں چھو کر بس اسی کا ہو کر رہ گیا تھا۔ تب یہ ویرانہ تھا۔''

گہرا سانس لیتا ہے۔ اس کی آواز...... اگر یہ جگہ کھلا کلب ہے تو گھٹے گھٹے قہقہوں اور تیز موسیقی میں' اگر ریستوران ہے تو بحث و تکرار میں' اور اگر فٹ پاتھ ہے تو آپ راہ گیروں کی

چاپ سے ڈوب کر ابھرتی ہے۔

''مرشد' تن کے کپڑوں سے بے نیاز' صرف ایک کالے رنگ کا جھولا' گلے میں ڈالے' لوہے کے بڑے بڑے گولوں کو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریوں کی تہیں جمی تھیں۔ بدن کے سیاہ چمڑے سے رگوں کی ڈوریاں باہر آ رہی تھیں۔''

''پلید تو بڑا بھاگوان ہے۔''

مرشد' اچانک جست لے کر دور تک بھاگتا چلا گیا تھا اور فضا میں کچھ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ واپسی پر اس نے بند مٹھی میرے سامنے کھولی تو ہتھیلی سے نیم مردہ ''سپ مکھی'' لڑھک کر ہمارے قدموں میں آ رہی۔

''واقعی بھاگوان۔''

لوہے کے گولے آگے پیچھے تیزی سے چلتے رہے۔

تب میں بوہنی پر خوش ہو کر ناچنے لگا' ناچتے ناچتے ایک آدھ چکر میں' مرشد کی کمر میں بھی بازو ڈال دیئے۔ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ میں بھاگوان کیسے ہوں۔

''تو اتنا عرصہ رہا کہاں...... تیرے طفیل' آج اس بڑھاپے میں پہلی بار میں نے اس کے ہونے کی نشانیاں دیکھیں۔ وعدہ کر' مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گا۔''

مرشد نے میرا ہاتھ' اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر' ناگ پھنی کی باڑ کے ساتھ' پگڈنڈی کی نرم دھول پر بنے لہریئے پر نظریں گاڑے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔ میں بے پروا' ناگ پھنی کے پھول گنتا رہا۔ ''سات۔ سات۔ سات۔''

''افسوس...... پورے چار دن پہلے' اس جگہ سے اس کا گزرا ہوا ہو گا۔''

پگڈنڈی کی نرم دھول پر مانند پڑتا لہریا' چاروں سمت پھیلی اونچی گھاس تک جا کر گم ہو گیا' اور ہم دونوں' رات دن' بھوکے پیاسے لکیر پیٹتے رہے۔ پانچویں دن زائچہ کھینچ کر' مرشد نے

سفر کا حکم دیا۔

ہم چلتے رہے۔ حتیٰ کہ مرشد نے ایک دن میرے سر سے سفید بال چنے۔

مرشد چپ تھا۔ میں نے تنگ آ کر جھولے میں سے اس کی بین نکالی اور بغیر سر کے بجائے گیا۔ سامنے مرشد جھوم جھوم کر چل رہا تھا۔ اس کی نظریں زمین پر ہل چلا رہی تھیں۔

مجھے یوں لگا جیسے ہم دائرے میں سفر کر رہے ہوں۔

''دیکھتے جاؤ اور بھولتے جاؤ۔''

اس کا کہا میں نے پلے باندھا۔ جو دیکھا' بھول گیا۔ لیکن ہر پڑاؤ پر مرشد مجھے خالص سونا دیتا تھا' اتنی مقدار میں' کہ میں بھاگ نہ سکوں۔

''بیٹا زر کی کوئی حقیقت نہیں۔''

''لیکن مرشد' آخر یہ؟''

''ہتھیلی پر سرسوں کا کیا کام؟''

اس کے ہاتھوں کے گولے تیزی سے حرکت کرنے لگتے اور میں نئے سرے سے اپنی سانسیں گننی شروع کرتا۔

''دیکھو۔''

کلمے کی انگلی کی پہلی پور پر پانی کا قطرہ لے کر' میری آنکھ کے ساتھ' سر پر چمکتے سورج کی شست لیتا اور دوسرے ہاتھ کا منشور میری دائیں آنکھ پر ٹکا دیتا۔

شفاف قطرہ' سات رنگوں میں لشکتا تھا۔ سرخ' نارنجی' پیلا' سبز' نیلا' آسمانی' بنفشی۔

''تب دیکھنا' رنگوں کی یہ ترتیب نہیں رہے گی۔ اس ترتیب میں تو سب دیکھتے ہیں۔'' مرشد نے کہا۔

''اس دن اس کا الٹ ہوگا' پھر اس نے ظاہر ہونا ہے۔ یاد رکھو...... بنفشی رنگ پہلا رنگ ہوگا۔ اس کے منہ سے شعلے نکل رہے ہوں گے اور اس پر نظر نہیں ٹھہرے گی۔ وہ غصے میں

چاروں طرف حملہ کرتا ہوا بڑھے گا۔لیکن وہ دیکھ نہیں سکتا' آنکھوں کے ہوتے اندھا ہے۔اس کے سامنے جو جائے گا بھسم ہو جائے گا۔تم بس اپنی جان بچانا...... وہ دن' اس دن یا وہ ہو گا یا میں......''

آخری جملہ ادا کرتے ہوئے مرشد کی دھنسی ہوئی انگارہ آنکھیں مسکراتیں' جن میں ایک ہلکی لہر خوف کی ہوتی۔

میں نے پہلی بار یہ سب سن کر بھاگ نکلنے کا منصوبہ بنایا۔

اس نے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے' مجھے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔اب میں کھل کر ظاہر ہو چکا تھا۔اس نے جھٹکے سے جھولا چھین لیا۔

''تم جانا چاہتے ہو تو اب بھی وقت ہے۔''

''میں جنگل خوار' آگے بڑھا اور اس کے پاؤں پکڑ لئے۔''

اس کا خوفناک قہقہہ جنگل کے سناٹے میں چاروں کھونٹ گڑ گیا' پھڑ پھڑایا۔درختوں کے شور کرتے پرندے' ہمارے سروں پر تنی چاندر کو داغدار کرتے ہوئے اوپر اٹھتے رہے۔

''ابھی فیصلہ کرلو۔لیکن اگر اس کے بعد تم نے ایسا سوچا' تو دو کوس تک تو میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔آگے نکل گئے تو تمہاری قسمت۔''

اس نے نیفے کے اندر ہاتھ ڈال کر بہت چھوٹی زنگ آلود ڈبیہ نکال کر دکھائی۔

''اس ''اڑن سانپ'' کا نشانہ تمہارا ماتھا ہوگا۔کہو تو اسے کھولوں' تجربہ کرلو۔''

میں نے ماتھے پر دونوں ہاتھ جوڑ کر اپنا سر اس کے قدموں پر رکھ دیا۔مرشد سوچ میں پڑ گیا۔پھر دھیرے دھیرے اسے نیفے میں اڑستا مجھ پر جھک گیا۔

میں نے اٹھ کر جھولا ایک بار پھر کندھے پر ڈال لیا۔چالیس سال جھولے اور مرشد کو کندھوں پر اٹھائے پھرا۔خدمت کی۔

سب دنوں کی طرح ایک دن' اس نے کلمے کی انگلی کی پہلی پور پر پانی کی بوند لے کر' میری آنکھ کے ساتھ سر پر چمکتے سورج کی شست لی۔

یکا یک جھولا جھپٹ کر اس نے بین نکالی۔ زور زور سے چاروں سمت گھوم کر بجانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک عود کر آئی۔ وہ بے اختیار' جھومتے ہوئے بین بجا رہا تھا۔

میں حیران' اس کی سمت تکتا رہا۔ تب سورج کے بالکل سامنے مغرب میں دھنک بنی۔ آدھی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا قوس......

پہلا رنگ بنفشی تھا۔

وہ مسلسل بین بجاتے ہوئے پاگل ہو رہا تھا۔ میں پھولے ہوئے ہاتھ پاؤں سے دوڑ دوڑ کر اس کے سامنے لکڑیوں کی ڈھیریاں بناتا گیا۔ میرا مرشد' قبر میں پاؤں لٹکائے بوڑھا' پسینے سے شرابور' اسی شدت سے چاروں سمت گھوم کر بین بجاتا رہا۔

یکا یک بالکل سامنے لکڑیوں کی ڈھیری بھک سے جل اٹھی۔

''اوٹ میں ہو جا۔ جان بچا۔'' وہ خود بھی درختوں کی ڈھیریوں کے گرد بین بجاتے ہوئے چھپتا پھرتا تھا۔

یہ لک چھپ سارا دن جاری رہی۔

ایک ایک کر کے تمام ڈھیریاں راکھ بنتی گئیں۔ مرشد کے گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ اس کی نگاہوں کی تیز گردش' اب ایک زاویے پر جم سی گئی۔

میں نے کیکر کی اوٹ سے اس طرف نگاہ کی۔

مرشد کے سامنے' وہ جسے میں نے پہلی بار دیکھا' پھن پھیلائے' زمین سے آدھا اوپر اٹھا' بین کے اشارے پر لہرا رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے نکلتے شعلے ماند پڑ چلے تھے اور مرشد ہر لمحے اس کے قریب ہو رہا تھا۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں دونوں کا درمیانی فاصلہ صرف آٹھ قدم رہ گیا۔ پھر اس نے

سب دنوں کی طرح ایک دن' اس نے کلمے کی انگلی کی پہلی پور پر پانی کی بوند لے کر' میری آنکھ کے ساتھ سر پر چمکتے سورج کی شست لی۔

یکا یک جھولا جھپٹ کر اس نے بین نکالی۔ زور زور سے چاروں سمت گھوم کر بجانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک عود کر آئی۔ وہ بے اختیار' جھومتے ہوئے بین بجا رہا تھا۔

میں حیران' اس کی سمت تکتا رہا۔ تب سورج کے بالکل سامنے مغرب میں دھنک بنی۔ آدھی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا قوس......

پہلا رنگ بنفشی تھا۔

وہ مسلسل بین بجاتے ہوئے پاگل ہو رہا تھا۔ میں پھولے ہوئے ہاتھ پاؤں سے دوڑ دوڑ کر اس کے سامنے لکڑیوں کی ڈھیریاں بناتا گیا۔ میرا مرشد' قبر میں پاؤں لٹکائے بوڑھا' پسینے سے شرابور' اسی شدت سے چاروں سمت گھوم کر بین بجاتا رہا۔

یکا یک بالکل سامنے لکڑیوں کی ڈھیری بھک سے جل اٹھی۔

''اوٹ میں ہو جا۔ جان بچا۔'' وہ خود بھی درختوں کی ڈھیریوں کے گرد بین بجاتے ہوئے چھپتا پھرتا تھا۔

یہ لک چھپ سارا دن جاری رہی۔

ایک ایک کر کے تمام ڈھیریاں راکھ بنتی گئیں۔ مرشد کے گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ اس کی نگاہوں کی تیز گردش' اب ایک زاویے پر جم سی گئی۔

میں نے کیکر کی اوٹ سے اس طرف نگاہ کی۔

مرشد کے سامنے' وہ جسے میں نے پہلی بار دیکھا' پھن پھیلائے' زمین سے آدھا اوپر اٹھا' بین کے اشارے پر لہرا رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے نکلتے شعلے ماند پڑ چلے تھے اور مرشد ہر لمحے اس کے قریب ہو رہا تھا۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں دونوں کا درمیانی فاصلہ صرف آٹھ قدم رہ گیا۔ پھر اس نے

سب دنوں کی طرح ایک دن‘ اس نے کلمے کی انگلی کی پہلی پور پر پانی کی بوند لے کر‘ میری آنکھ کے ساتھ سر پر چمکتے سورج کی شست لی۔

یکا یک جھولا جھپٹ کر اس نے بین نکالی۔ زور زور سے چاروں سمت گھوم کر بجانے لگا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک عود کر آئی۔ وہ بے اختیار‘ جھومتے ہوئے بین بجا رہا تھا۔

میں حیران‘ اس کی سمت تکتا رہا۔ تب سورج کے بالکل سامنے مغرب میں دھنک بنی۔ آدھی ٹوٹی ہوئی چوڑی کا قوس......

پہلا رنگ بنفشی تھا۔

وہ مسلسل بین بجاتے ہوئے پاگل ہو رہا تھا۔ میں پھولے ہوئے ہاتھ پاؤں سے دوڑ دوڑ کر اس کے سامنے لکڑیوں کی ڈھیریاں بناتا گیا۔ میرا مرشد‘ قبر میں پاؤں لٹکائے بوڑھا‘ پسینے سے شرابور‘ اسی شدت سے چاروں سمت گھوم کر بین بجاتا رہا۔

یکا یک بالکل سامنے لکڑیوں کی ڈھیری بھک سے جل اٹھی۔

''اوٹ میں ہو جا۔ جان بچا۔'' وہ خود بھی درختوں کی ڈھیریوں کے گرد بین بجاتے ہوئے چھپتا پھرتا تھا۔

یہ لک چھپ سارا دن جاری رہی۔

ایک ایک کر کے تمام ڈھیریاں راکھ بنتی گئیں۔ مرشد کے گلے کی رگیں پھٹنے کے قریب تھیں۔ اس کی نگاہوں کی تیز گردش‘ اب ایک زاویے پر جم سی گئی۔

میں نے کیکر کی اوٹ سے اس طرف نگاہ کی۔

مرشد کے سامنے‘ وہ جسے میں نے پہلی بار دیکھا‘ پھن پھیلائے‘ زمین سے آدھا اوپر اٹھا‘ بین کے اشارے پر لہرا رہا تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ سے نکلتے شعلے ماند پڑ چلے تھے اور مرشد ہر لمحے اس کے قریب ہو رہا تھا۔

شام کے ملگجے اندھیرے میں دونوں کا درمیانی فاصلہ صرف آٹھ قدم رہ گیا۔ پھر اس نے

شعلے بکھیرتے ہوئے مرشد کی سمت جست لی۔
مرشد نے ایک طرف ہٹ کر نیفے میں اڑسی چھری کا وار کیا اور دونوں ایک ساتھ زمین پر آ رہے۔
مرشد کے قدموں سے دو ہاتھ ادھر۔ وہ سر کٹا' تڑپتا رہا۔ اس کی لمبی دم' بھوبل زمین پر کوڑے برسا رہی تھی۔ میں نے اوٹ سے نکل کر' نڈھال مرشد کا سر اپنے زانو پر لے لیا۔
اکھڑا ہوا سانس رات کے دوسرے پہر بحال ہوا۔
اس نے ہوش میں آتے ہی جھٹ میرا گریبان پکڑا۔
''کہاں ہے وہ؟''
میرا جواب سننے سے پہلے مرشد نے میرے زانو سے لڑھک کر اپنے پیروں میں پڑے سر کٹے کو تھام لیا۔ ہاتھ کی چھری سے ٹکڑے کرتا' کچا کھاتا رہا۔
''تو بھی کھا۔''
میں نے بادل نخواستہ کھانا شروع کیا' ابکائیاں کرتا' کھاتا رہا۔ ابکائیاں کرتا رہا۔
مرشد' سیر ہو کر وہیں ڈھیر ہو گیا اور میں نقاہت سے بے حال' مرشد کا حکم نہ ٹالتے ہوئے کھاتے کھاتے وہیں سولی پر اونگھ گیا۔
چار پہر بعد جب آنکھ کھلی تو مرشد وہاں نہیں تھا۔
میں نے اسے بہت ڈھونڈا۔
جب سے اب تک ایک صدی ہو گئی' میں جوان سے بوڑھا اور بوڑھے سے جوان ہوتا ہوں۔ میرے بچے میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اگر تو سن رہا ہے تو خدا کے لئے میرا نام لے کر بلا۔ ''میں تیرا کتا' قدموں کی خاک بہت تنگ ہوں......''
کالی چادر سے آنکھیں ملتا۔ صبح کی...... ہر لحظہ بڑھتی روشنی میں وہ ہجوم پر نگاہ کرتا ہے۔
اس سے نگاہیں کوئی نہیں ملاتا۔ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جاتی ہے۔ ستے ہوئے چہرے کو کالی چادر سے ڈھانپ لیتا ہے۔سسکتا ہے۔

''ہماری ملاقات کہیں بھی ہوسکتی ہے' چائے خانے میں' مصروف سڑک پر' ریلوے سٹیشن یا...... یہاں' اس جگہ......''

زور زور سے ہچکیاں لیتا ہے۔ دونوں سفید پوش' جن کے سر اور بھوؤں کے بال خالص چاندی ہیں' اس کے قدموں میں بیٹھے' کپکپاتے ہاتھوں سے اسے تھام کر تسلیاں دیتے ہیں۔

تب میں مجمعے کو چیرتا ہوا' لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھتا ہوں۔

وہ چادر ہٹا کر دونوں ہتھیلیوں سے آنکھوں کو ملتا' مجھے پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

میں برابر میں پہنچ کر' ایک زوردار مکا اس کے جبڑے پر رسید کرتا ہوں۔ ایک جھٹکے سے اس کا سر دائیں جانب جھک جاتا ہے۔

''پکڑو' مارو' نہ جانے پائے۔'' پورا مجمع ہم دونوں کو گھیرے میں لیتا ہے۔

''میں...... تیرا کتا قدموں کی خاک......''

وہ منہ سے خون تھوکتا' کھانستا' میرے سامنے دوزانو ہو جاتا ہے۔

سامنے کے دونوں دانت اس کے ہاتھ میں ہیں۔

○

بستہ الف اور بے

سائین بورڈ کی زنگ آلود پشت......

''سرائے عالمگیر' دو روپے چار پائی بستر۔'' سرائے کے غلیظ تنگ کمرے کی اکلوتی کھڑکی کو اشتہار پوری طرح ڈھانپے ہوئے ہے۔

افسانہ نگار' کڑوے گاڑھے دھوئیں میں ڈوبا' چھدری ادوائن کی کسی ہوئی چار پائی پر کروٹ لیتا ہے۔

سامنے فرش پر......

دوسرا' پہلے کی رام کہانی سن کر چھینٹے کا گہرا کش لگاتا ہے۔ کھانستا ہے' کش لگاتا ہوا دوہرا ہوتا ہے۔ وہ دونوں گاڑھے دھوئیں میں کڑواہٹ کا تڑکا لگا رہے ہیں۔

''یار اپن میں فرق صرف اتنا ہے کہ تمہاری ناک لمبی ہے اور میری چھوٹی۔''

''لیکن میں ناک استعمال نہیں کرتا۔''

''مان گئے استاد' پھر ہو بھی سولہ سترہ کی...... استاد چونی کا گھیر' ایمان سے سات سال عمر بڑھ جائے......''

''تب تو میری عمر ۲۰ دھائیوں سے بھی اوپر نکل گئی۔ لا ہاتھ۔''

ہاتھ پر ہاتھ مار کر دونوں ہنستے اور کھانستے ہوئے' جھک کر باری باری براہ راست دھواں پھیپھڑوں کو پہنچاتے ہیں۔

''یار' تم نے بات سولہ آنے کی ہے۔''

''ہاں سولہ سال اور سولہ آنے' لاہاتھ۔''

لمبی ناک والے نے انگارے پر گولی کی مقدار میں اضافہ کرتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ دوسرا استاد ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے' اٹھتے دھوئیں پر جھک گیا۔

''یار' پہلی بار ہوا یوں کہ میں تھا بہت شرمیلا اور وہ' اللہ مافی' میرے پسینے چھوٹے ہوئے۔''

''استاد آگے کی کہو۔''

''بس یار' پھر جب اپن کو ہوش آیا تو وہ بیہوش۔ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا کروں۔ ایسے میں تم جانو استاد ہٹنے کو جی کہاں مانے ہے؟ اچانک جو ہٹا ہوں تو پھر بے ہوش' لاہاتھ۔''

زور سے دونوں ہاتھوں کی تالی بجی اور وہ کھانستے اور ایک دوسرے پر تھوکتے ہوئے بے سدھ ہو گئے۔

میں اس لمحے کا تماشائی' تمام عمر کا تماشائی ٹھہرا کہ وہ دونوں میرے علاقے کے تھے۔ اور ہر لحاظ سے ایک تھے۔

پہلی ہی ملاقات پر دوئی ختم ہو گئی۔ اگلے روز دونوں کی عمروں میں سات سات سال کے اضافے کے ساتھ شلوار کا ساق بھی ہو گیا۔ ہر وقت اکٹھے رہنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا اور جم کر نفرت کی۔

دونوں ''بستہ ب'' کے تھے۔ دونوں کے پاؤں میں چکر تھا۔

وہ آگے آگے' پولیس پیچھے پیچھے' ساری زندگی اسی چکر میں بیت گئی۔

گھر بار دونوں کا نہیں تھا۔ جب کبھی ضرورت محسوس ہوئی' دونوں اپنی بیاہتا بہنوں کے

ہاں چلے جاتے۔

لمبے عرصے بعد بھائی گھر پر آتا تو وہ خوشی سے ہر طرف دوڑی دوڑی پھرتیں۔ ان دونوں کو دیکھنے کے لئے دونوں محلوں کی عورتیں اکٹھی ہو جاتیں۔

سب کی بہنیں ایک سی ہوتی ہیں......

وہ رات، دونوں گھوڑے بیچ کر سوتے اور جب آنکھ کھلتی تو بستر لپیٹ، کندھے پر ڈال، بہن کے گھر کو خیر باد کہتے۔ کرایہ بنانے کے لئے راستے میں جو بھی خریدار بنتا، اونے پونے بیچ، ٹکٹ کٹاتے۔

دونوں کی بہنیں بھائیوں کے انتظار میں دن گنتیں، اور ان کے لئے نئے بستر بناتیں......

رات دن اکٹھے......

اکثر ایسا بھی ہوا کہ کہیں کوئی ایک بہک گیا اور دوسرے نے جھٹ اس کی تلاشی لی۔ چاندی بنائی اور سٹک گیا۔ سفر دونوں کر رہے ہیں، خدا نے چاہا تو کبھی میل ہو ہی جائے گا اور ہر بار میل ہو کر رہا۔

مدت بعد ملاقات پر گلے ملتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کے بٹوے کی ٹوہ لگاتے۔

کون جانے کس گھڑی، کون بہک جائے۔

دونوں ہم عمر تھے لیکن پہلی بار جس نے دوسرے کے ساتھ ہاتھ کیا، وہ بڑا ٹھہرا اور دوسرا چھوٹا۔ چھوٹا اسے استاد کہتا۔ بڑا باتونی تھا، وہ باتیں کرتا رہتا...... چھوٹا ''ہوں ہاں'' کرتا سو جاتا۔ وہ سویا رہتا اور بڑا باتیں کرتا رہتا......

تجربہ کی بنا پر دونوں چھوٹے دہانے والی لڑکی پر جان دیتے تھے اور اگر کمر بھی پتلی ہو تو کیا بات ہے۔ لیکن محبت کے معاملہ میں دونوں اس ٹٹو کی مثال تھے جسے گھوڑی کی طلب جگانے کے لئے ساتھ باندھا جاتا ہے اور دیگر معاملات میونسپلٹی کے تھارو بریڈ گھوڑے کے سپرد ہوتے ہیں۔

دونوں کی زندگی میں پہلی اور آخری بار......

ہم اسے بھی اتفاق ہی کہیں گے کہ دونوں ایک ہی لڑکی پر مر مٹے۔ لڑکی کے چہرے پر منہ نہیں تھا اور کمر کے معاملہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ڈھیلی قمیض پہنے رہتی تھی۔

اس حادثے کے بعد دونوں کے خون کی گردش میں بے اعتدالی نے جگہ بنا لی۔ رات کی نیند اڑ گئی' ساتھ رہتے ہوئے ایک دوسرے کو کھو بیٹھے۔

ہر وقت ایک ہی دھن......

گلی میں آتے جاتے' دونوں سے' باری باری لڑکی نے ظالم سماج کا رونا رویا اور وقت بے وقت ملتے رہنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ اس نے یہ اطلاع بھی دے دینا مناسب سمجھی کہ عنقریب ان کے خاندان کا کوئی نوجوان بارات لائے گا اور ڈنکے کی چوٹ اس کے ساتھ منہ کالا کرے گا۔

محبوبہ سے فرداً فرداً مل کر دونوں نے حال دل ایک دوسرے کو سنایا۔ دونوں جب تفصیل سن چکے تو پہلے حیران ہوئے پھر پریشان اور پنجوں پر کلپ چڑھایا' مار مار کر ایک دوسرے کے چہرے بگاڑ دیئے۔ لہولہان' دونوں رقیب اس دن با ہوش وحواس پہلی بار ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔

اب ملاقات کوئے یار میں ہونا تھی......

اس طویل جدائی میں دونوں محبوبہ کا نام لے کر رنڈی بازی سے بہت آگے کی بازیاں لگاتے رہے۔ میل ہوا تو پتا چلا کہ بڑا مزید باتونی ہو گیا ہے' اپنی ہی کہتا ہے' دوسروں کی نہیں سنتا اور چھوٹا صرف دوسروں کی سنتا ہے اپنی نہیں کہتا۔

قاعدے کی رو سے بڑے کو ملاقات کا پہلے موقع ملا۔

محبوبہ سے اسی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ملاقات پر پتا چلا کہ آنے والا ابھی تک نہیں آیا۔ اس لئے منہ کالا ہونے سے رہ گیا۔

بڑے نے نرم نگاہی کی شہ پاکر باتیں شروع کیں۔ وہ دیر تک گم سم بیٹھی سنتی رہی۔ وداع ہوتے وقت اس نے مشورہ دیا کہ موصوف کو کہیں سے مانگ تانگ کر نئے بوٹ ضرور خرید لینے چاہیں۔ اسے یہ بات سمجھ میں نہ آئی کہ محبت اور نئے بوٹوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔

چھوٹے نے بڑے کی ناکامی پر بغلیں بجائیں اور محبوبہ کے سامنے بت بن گیا۔ مدت بعد کی ملاقات پر صرف ایک بات ہوئی۔ موسم کے بارے میں......

دونوں چپ' ایک دوسرے کو تکتے رہے' لڑکی نے بازو پھیلا کر زور کی انگڑائی توڑی اور اس کے جبڑے سہلاتے ہوئے یہ بتا کر اندر چلی گئی کہ زیادہ باتیں کرنے سے چہرے کی ساخت پر برا اثر پڑتا ہے۔

دونوں پریشان حال ایک بار پھر نکل کھڑے ہوئے۔

اگلی ملاقات پر دونوں ایک دوسرے کا الٹ تھے۔ نتیجہ پھر وہی نکلا۔

کسی سیانے نے مشورہ دیا......

عورت پورا مرد مانگتی ہے۔ ناسمجھوں نے چھوٹتے ہی دست درازی کی اور منہ کی کھائی۔ محلے دار لڑکی کی داد کو پہنچے اور سماج کے ظالم نمائندے ہونے کا عملی ثبوت پیش کیا۔ ہوش آنے پر دونوں ایک دوسرے کو پہچان بھی نہ سکے۔

یہاں تک کی رام کہانی انہوں نے ساری دنیا کو سنا ڈالی۔ آگے کی افسانہ نگار کہتا ہے۔

ابھی چند روز پہلے کی بات ہے' اپنے ہی علاقے کے ''بستہ الف'' کا ایک پھٹیچر نوجوان' پولیس کا سلطانی گواہ پوری بات سن کر ہنس پڑا اور ہنستا چلا گیا۔ دونوں سے اس کنگلے کی ہنسی نہ دیکھی گئی۔ چاقو نکال' مارنے دوڑے۔

اس نے ہاتھ جوڑے اور لوگوں کو بتایا کہ وہی بارات کے لوگ اکٹھے کرتا پھر رہا ہے۔

اور وہ آنے والا وہی ہے' جس نے ڈنکے کی چوٹ......

منہ کالا ہونا پتھر پر لکیر تھا......

سب لوگ حیران، دیکھا کئے۔ اس نے گلے کا ریشمی رومال پھیلا دیا۔ شادی کے لئے چندہ کیا اور ان کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔

دونوں استاد اس کے ساتھ تھے۔

تنہائی میں پہلی ہی ملاقات پر لڑکی نے ان دونوں پر تین حرف بھیجے اور اس کے گلے کا ہار بن گئی۔ پھٹیچر نوجوان نے لڑکی سے ہر بات کی، سوائے موسم کے بارے میں۔

دونوں استادوں نے رات بھر ڈیوڑھی کی کھری چارپائی کا جو نظارہ چھپ کر کیا تھا، اس کی تصدیق اگلے روز شادی رجسٹر پر ہوئی۔

دونوں نے اس کنگلے کے نکاح نامے پر بطور گواہ انگوٹھے ثبت کئے۔

O

کہانی کا بڑھاپا

نواب بیگم کی پریشانیوں کا کوئی شمار نہیں۔ میلوں پھیلی ہوئی حویلی میں، نوکر، باندیاں اور خدا کا دیا سب کچھ ہے، لیکن وہ ہیں کہ ملول و دل فگار ہیں۔

اکثر راتوں کو سوتے میں ان کی آنکھ کھل جاتی ہے اور نیند کے غبار میں ایک ننھا بالک زور زور سے ہاتھ پاؤں چلاتا ہر طرف سے ان کی سمت بڑھا چلا آتا ہے۔ تکیئے والے پلنگ کے پیچھے سے چھپتا چھپاتا، بھاری ریشمی پردوں کی اوٹ میں، شہ نشینوں کے اوپر نیچے کلکاریاں مارتا اور ہچکی کے تسلسل میں روتا۔

نواب بیگم کی پریشانیوں کا کوئی شمار نہیں، وہ اٹھتی ہیں اور دبے قدموں طویل غلام گردشوں میں ڈوبتی ابھرتی اپنے لخت جگر، چھوٹے مرزا کے خواب کدے کی خبر لیتی ہیں۔ پھر ہر طرح مطمئن ہو کر فیصلہ کرتی ہیں کہ کل خواہ کچھ ہو، وہ بات آگے بڑھائیں گی۔

یہ بات آگے بڑھانے کی گھڑیاں ایسی ہیں، جن میں حویلی کے نوکر چاکر تمام وقت تھر تھر کانپتے رہتے ہیں۔ پری چہرہ لڑکیوں کا ذکر پہلے چھڑتا ہے اور پھر خاندانوں سے بات نکل کر جائیداد کی جمع تفریق تک آجاتی ہے۔ تب مرزا بہادر پہلو بدلتے اور توجہ فرماتے ہیں۔ دیر تک سب کے لئے نچی تلی مغلظات کا بازار گرم رہتا ہے۔ گھر کے ملازمین سے نواب بیگم تک سب

کی جھاڑ پونچھ ہوتی ہے اور آخر میں آپ بہادر' اپنی نحیف ٹانگوں پر ڈولتے اور تھر تھر کانپتے ہوئے اٹھ جاتے ہیں۔ اس توجہ فرمانے اور نواب بیگم کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے کی گھڑی سے بہت پہلے' چھوٹے مرزا اجازت طلب کر چکے ہوتے ہیں۔ بات وہیں رہتی ہے' جہاں سے چلی تھی۔

کیا کہوں نواب بیگم کی پریشانیوں کا کوئی شمار نہیں۔

یہ سب پہلی بار چھوٹے مرزا کی پندرھویں سالگرہ پر ہوا تھا اور اب تک ہوتا آیا ہے۔ نواب بیگم اور مرزا بہادر کی سفید بھنویں ان کے ڈھیلے پپوٹوں پر جھک آئی ہیں اور چھوٹے مرزا کی کنپٹیوں سے سفید بال اتر کر ان کی ریشمی داڑھی میں بہت دور تک نکل گئے ہیں۔ صرف ایک بار' رات کے ایک پہر کے لئے ان معمولات میں فرق آیا تھا اور اس کے بعد سب کچھ حسب معمول ہے۔

ان معمول سے ہٹی ہوئی گھڑیوں کے لئے وقوعہ کا انتخاب کن لوگوں نے کیا تھا اور اس کے پیچھے کس کس کا ہاتھ تھا' یہ راز رفتہ رفتہ ہی کھلے گا۔ ابھی تو بحث جاری ہے' نوکر چاکر تھر تھر کانپ رہے ہیں اور جائیداد کی جمع تفریق سے بات آگے نہیں نکلی۔

ابھی ابھی' جس کا ذکر ہوا' وہ پہلا اور آخری غیر معمولی واقعہ تھا' جو حویلی کے جنوبی کونے میں رونما ہوا۔ حویلی کا یہ وہ حصہ ہے جو ڈھیلے ڈھالے برگد اور بے طرح بڑھی ہوئی خودرو جھاڑ جھنکار میں پوری طرح چھپ گیا ہے۔ حویلی کے اس حصے کی رات ایک حد تک ڈراؤنی ہے۔ دن چڑھے بھی کوئی اس طرف کا رخ نہیں کرتا۔

جب سے بڑے مرزا مرحوم ہوئے' حویلی کا یہ حصہ دن بدن ویران ہوا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے متصل دو بڑے کمرے ہیں جہاں ایک طویل مدت تک بڑے مرزا کی گھٹی گھٹی کھانسی کی گونج مسلسل سرگرداں رہی ہے۔ اب ان کمروں میں بچھے چھوٹی اینٹوں کے پختہ فرش میں درزیں نمایاں ہوگئی ہیں اور ان میں خودرو گھاس نے جگہ بنالی ہے۔ چھت کے ٹپکتے

رہنے سے اندر کا فرنیچر تباہ ہو چکا ہے۔ ملگجے اندھیرے میں سانپ رینگتے ہیں اور گھاس کی مسلسل سرسراہٹ نے اس حصے کو پراسرار بنا دیا ہے۔

ان بہتی ہوئی راتوں میں سے ایک رات ہوا یہ کہ حویلی کے اس جنوبی کونے میں نیلے کمرے کے سیلن زدہ فرش پر ٹھہری ہوئی' بڑے مرزا کی منقش' چار ہاتھ چوڑی مسہری پر' کریمن بوا کی جوان لڑکی نے درد سے پچھاڑیں کھائیں۔ تین پہر رات تک اسے کوئی پوچھنے نہ آیا۔ اس سے پہلے اس نیلی پڑتی ہوئی لڑکی نے رسوائی کے خوف سے پورے چار ماہ آتش دان کے ساتھ دھرے لکڑی کے بڑے صندوق میں چھپ کر گزارے تھے۔

یہ اسی دن کی بات ہے جب صبح ناشتے پر چھوٹے مرزا نے صرف اتنا کہا تھا:

''ابا حضور' سلطان پورہ کے کھلے راستے سے پرانے درخت کٹوا دیئے گئے۔ کیا گھنا سایہ تھا' ہم کبھی اس طرف سیر کو نکل جایا کرتے تھے' ابا حضور۔ اکیلے' یونہی گھومتے گھماتے۔''

بس یہیں سے باتوں کا رخ بدلا۔ نواب بیگم ایسے مواقع کی ٹوہ میں رہتی تھیں۔ چھوٹے مرزا نے موقع پا کر اجازت طلب کی اور سب سے آخر میں حسب معمول مرزا بہادر اپنی نحیف ٹانگوں پر ڈولتے اور تھرتھر کانپتے ہوئے اٹھ گئے۔ یہ اسی رات کی کہانی ہے۔

جب نواب بیگم کی آنکھ کھلی تو ننھے بالک کے رونے کی آواز امڈ کر بڑھتی ہوئی ہر طرف پھیل رہی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لئے ساکت' مسہری سے ٹیک لئے بیٹھی رہیں۔ آواز مسلسل آ رہی تھی' جیسے نیند کے غبار میں ایک ننھا بالک زور زور سے ہاتھ پاؤں چلاتا' ہر طرف سے بڑھا چلا آتا تھا۔ نواب بیگم نے گاؤ تکیوں کو جھاڑا' بھاری پردوں اور شہ نشینوں سے ہوتی ہر طرف پھر گئیں...... آواز آ رہی تھی۔ دبی دبی اور ٹھہر ٹھہر کر اٹھتی اور ہر طرف پھیلتی ہوئی۔ وہ اٹھیں اور اٹھ کر لیمپ کی لو بڑھا دی۔ کمرے میں مرزا بہادر کے خراٹوں کی آواز ایک تسلسل سے گونج رہی تھی۔

نواب بیگم نے کھڑکی کا ریشمی پردہ سرکا کر باہر اندھیرے میں جھانکا۔ ایسے میں سرد ہوا کا

اک جھونکا ان کے چہرے سے ٹکرایا اور بدحواس ہو کر گمراہ ہوا۔ نواب بیگم کو باہر کھلے میں چوکیوں پر اونگھتے ہوئے چوکیدار متحرک لگے اور بکھری اشیاء شکلیں تبدیل کرتی ہوئی نظر آئیں۔ وہ کھڑکی کے پٹ بھیڑنا چاہ رہی تھیں کہ آواز ایک بار پھر کروٹیں لیتی ہوئی اٹھی۔

نواب بیگم حویلی کے جنوبی کونے کی طرف متوجہ ہوئیں اور غلام گردشوں سے ہوتی اپنے لخت جگر کی خواب گاہ کو جھانک آئیں۔ اور دیر تک اپنے کمرے کی کھڑکی سے لگی سوچتی رہیں۔ پھر یکایک انہوں نے چادر کی بکل ماری اور دروازوں پر چوبداروں کو اونگھتا ہوا چھوڑ' اکیلی ہی آواز کے تعاقب میں نکل کھڑی ہوئیں۔

تاریک ٹھہرے ہوئے اندھیرے میں لمبی گھاس لہریئے لے رہی تھی۔ انہیں نیلے کمرے میں روشنی کی جھلک نظر آئی تو جھجکتی ہوئی ادھر مڑ گئیں۔ وہ یوں بڑھ رہی تھیں' جیسے کوئی انہیں باندھ کر لئے جاتا ہو......

نیلے کمرے میں' اندر گیلے فرش پر ٹکی' دوہری ہوتی ہوئی مسہری پر چیتھڑوں میں گم' نیلا پڑتا ہوا پتھر کا بت' بوا کی چھوئی موئی لڑکی اور برابر میں والہانہ انداز میں ہاتھ پاؤں چلاتا' چھوٹے مرزا کا ناک نقشہ۔

بوا نے آگے بڑھ کر پاؤں پکڑ لئے۔

''حضور رحم۔ اس کلموہی نے کہیں آنکھ ملانے جوگا نہیں چھوڑا اور میں بد بخت' اس نامراد کا دوا دارو بھی نہ کر سکی۔''

نواب بیگم نے سنی ان سنی کی اور سب سے بے نیاز واپس آئیں' اس خوابوں کے ننھے شہزادے کو باہوں میں جھلاتی ہوئی۔ بوا کی کانپتی ہوئی آواز ان کے پیچھے گرتی پڑتی بس چلی آتی تھی۔

آج ننھے مرزا کی پندرھویں سالگرہ ہے۔

نواب بیگم اور مرزا بہادر کی سفید بھنویں ڈھیلے پپوٹوں پر ٹھہری ہوئی ہیں۔ ابھی کچھ دیر

پہلے پری چہرہ لڑکیوں کا ذکر چھڑا ہے۔ نوکر چاکر تھر تھر کانپنے لگے ہیں اور چھوٹے مرزا، جن کی کنپٹیوں سے نکل کر سفید بال ہر طرف پھیل گئے ہیں، مسلسل بولے چلے جا رہے ہیں۔ مغلظات کا بازار گرم ہے۔

کیا عرض کروں، نواب بیگم کی پریشانیوں کا کوئی شمار نہیں۔

○

بابے نُور محمد ے کا آخری کبت

میں بچہ تھا اور حیران رات دن تھے۔

مجھے ان سوالوں کا جواب آج بھی نہیں ملا' جوان دنوں میں نے شہر جانے والے دھول سمیٹے ہوئے کچے راستے اور اس کی دونوں جانب پھیلی کیکروں کی قطاروں سے پوچھے تھے۔ جواب میں حویلی کی چہار دیواری خاموش رہی تھی اور صدر دروازے کی دونوں چوکیاں میری طرح حیران۔

میں نے پوچھا' یہ ہوائیں کہاں سے آتی ہیں؟ یہ روشن دنوں کے درمیان ٹھہری ہوئی رات آخر کیا ہے؟

آج میں ان وقتوں کو یاد کرتا ہوں' اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں سے آنکھوں میں ٹھہری ہوئی رات کی دیوار کو کھرچتا ہوں۔

وہ ایک گہری شام تھی' جس میں غوطے کھاتے ہوئے میں نے بابے نور محمد ے کو دیکھا تھا۔ وہ شام تھی اپنے ہی زور میں زنجیر کڑکڑاتی' اپنے سامنے والے کھروں سے زمین ادھیڑتی' دھول اڑاتی' مستی میں آئی ہوئی شام۔

میں شاید آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ میں بچہ تھا اور وہ حیران کر دینے والے رات دن

تھے۔ میں نے وہ کھری حیرت' چہار جانب چنی ہوئی رات کی دیوار میں دیکھی ہے۔
یہ رات کی دیوار اور اس پر حیرت کی موٹی تہوں کا لیپ' جس میں سے ہر شے کا اصل روپ ابھرتا ہے۔ دن کو تو ہم سب نقالوں میں گھرے رہتے ہیں' سامنے کی چیزیں بھی نظروں سے اوجھل رہنے کی خاطر سوانگ بھرتی ہیں۔
آج کہانی کار مرزا حامد بیگ' اس نیکوں کے حجرے میں اس قصہ کا آغاز کر بیٹھا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ کہانی بھی اصل کہانی کی نقل ہو' اس لئے کہ یہ قصہ پرانا ہے اور قصے کہانیاں وقت گزرنے کے ساتھ کچھ کی کچھ ہو جاتی ہیں۔
ہاں تو میں کہہ رہا تھا' ان دنوں میں بچہ تھا اور وہ حیران کر دینے والے رات دن تھے۔ میں نیکوں کے حجرے میں کچے فرش پر پھیلی پلال پر' کہنیوں کے بل' سامنے بان کی چارپائی پر لیٹے ہوئے بابے نور محمد ے کے چہار بیتے سن رہا تھا۔ حجرے میں ہر طرف بابے کی ڈوبتی ابھرتی آواز ابھری تھی اور اس کی دائیں آنکھ سے پانی کی ایک پتلی لکیر اس کے نیچے نکلے ہوئے بازو کی آستین تک آ رہی تھی۔
وہ سنتا بہت اونچا تھا' بدن کے جوڑ' اسے جواب دے گئے تھے اور آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ آٹھوں پہر حجرے میں بان کی جھلنگا کھاٹ پر پڑا' کبت جوڑتا رہتا۔
اس کا کوئی نہیں تھا۔ اس کے بیٹھی ہوئی چھت والے کوٹھے کے ٹھنڈے آنگن میں انجیر کا بوٹا ہمارے دلوں میں دھڑکتا تھا اور بات کرتے ہوئے جب کبھی اس طرف خیال جاتا تو ہمارے منہ تک آئی ہوئی بات گلابی لیسدار انجیروں کے ساتھ رل مل کر کچھ کی کچھ ہو جاتی۔
میں پھر بھٹک گیا ہوں' دراصل بات ہو رہی تھی آپ کی طرح نیک لوگوں کے حجرے کی' جس میں نیچے بچھے ہوئے پلال پر میں کہنیوں کے بل لیٹا ہوا نور محمد ے کی تھرتھراتی آواز میں چہار بیتے سن رہا تھا۔
بابے نے گاتے گاتے' اپنے چولے کے تنے کے ساتھ دائیں آنکھ سے اترتی' پتلی لکیر

پونچھ ڈالی اور کچھ وقت چپ لیٹ کے چھت کی کڑیاں گنتا رہا' پھر کہنے لگا:

''منا' چھوڑ جھوٹے قصوں کو' میں تجھے اپنی کہانی سناتا ہوں' یہ میرے جوڑے ہوئے کبت اس کے سامنے کچھ نہیں۔''

میں نے زور سے ہنکارا بھرا۔

''ہاں تو منا' خدا تیری بھلی وار کرے' چھوٹے ہوتے کا قصہ ہے' مجھے لگی ہوئی تھی بھوک' پورے چار وقتوں سے کچھ نہیں کھایا تھا۔''

میں نے بابا کو یہاں ٹوک دیا۔

''کیوں بابا...... بالکل ایسے ہی' جیسے آج چار ویلے گزر گئے۔''

بابا چولے کا تنا دائیں آنکھ تک لایا۔

''ہاں' خدا تجھے اجر دے...... پورے چار ویلے گزر گئے تھے اور کھیل تک نہ اڑی تھی جو منہ تک آتی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ قحط پڑ گیا ہو۔ سارے میں زرجے بجے گھر آباد تھے' خموں میں بھرے خراب ہوتے ہوئے اناج کی بساند یہاں تک آ رہی تھی۔ ہر دروازے پر لیاری بندھی تھی' سب گھروں سے باہر نکلتے وقت حویلی کے اونچے دروازوں سے گردن نیوڑھا کر گزرتے تھے' سب کے سروں کے شملے مایا لگے تھے' اکڑے ہوئے' اور بھلیا لوکا' جھوٹ کہہ کر اپنی گور کیوں بھاری کروں' مجھ پر پورے چار ویلے گزر گئے تھے۔

یرا' پھر بھی وہ وقت اچھے تھے۔ سارا دن گلیوں میں رلتا تھا۔ ایک نے ''تو'''''تو'' کی' ادھر دوڑ پڑے' دوسری طرف سے آواز آئی' ادھر نکل گئے۔ جگہ جگہ منہ مار کے پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ بس یرا' ایسے ہی گزر گئی۔ ہم سر پھروں کو پتا ہی نہ چلا' زندگی کس طرح کرتے ہیں۔ تیرے دادا کو خدا جنت نصیب کرے' نیک آدمی تھا۔ لیکن یار وہ گاؤں آتا کبھی کبھی تھا' اور جب کبھی آتا تھا' دو گھوڑیوں پر لدے ہوئے چاندی کے روپوں کے توڑے بھر کر لاتا۔ اسے میں نے ہمیشہ ہرے رنگ کی صدری میں دیکھا تھا۔ پیروں میں روتی کرلاتی کھیڑیاں' واہ واہ بودے'

سنورے ہوئے اور دونوں گھوڑیوں کی باگیں ہاتھوں میں' جن پر لدے ہوئے چاندی کے روپوں کے توڑے۔

وہ آگے آگے اور یار لوگ پیچھے پیچھے' گھوڑیوں پر لدے ہوئے توڑوں سے چاندی گرتی رہتی اور ہم چنتے جاتے۔ تم جانتے ہو' کئی بار ہم نے بھی چاندی سے توڑے بھر لئے۔''

بابا بولے جا رہا تھا اور میں کہنیوں کے بل پڑے پڑے تھک گیا تھا اور مجھے پیشاب بھی آیا ہوا تھا۔ میں ہولے سے اٹھ کھڑا ہوا اور مسجد کے پچھواڑے چلا گیا۔

میں دیر تک بابے نور محمدے کے کچے صحن میں کھڑے ہوئے انجیر کی طرف تکتا رہا تھا' لیکن جب واپس آیا ہوں تو بابا اسی طرح مسکراتا ہوا اپنے پتلے پیلے ہاتھ لہراتا' اسی کروٹ پڑا تھا اور یہاں تک پہنچا تھا:

''ہاں...... وہ بھلے لوگ تھے۔ جب دن کی روشنی میں آتے تو یوں گھوڑیوں کی باگیں تھامے ہوئے اور جب آڑے تھڑے ہوتے تو گہری شاموں میں چپ' آہستگی کے ساتھ' اس حجرے سے منہ چھپا کر سیدھے حویلی کو نکل جاتے۔''

میں نے بابا کو پھر ٹوک دیا۔

''کیوں بابا' وہ گہری شاموں میں چھپ کر کیوں گزر جاتے تھے؟''

بابا ایک بار پھر چولے کے تنے کو اپنی دائیں آنکھ تک لایا۔ کچھ وقت چپ چاپ پڑا اپنے اکھڑتے ہوئے سانس درست کرتا رہا۔ پھر بولا:

''او یرا...... میں نے بتایا جو ہے کہ آڑے تھڑے وقتوں میں ایسا ہوتا تھا۔ نیک بندوں کے پاس جب غریب غربا کو دینے کے لئے کچھ نہ ہوتا' تو وہ اسی طرح کرتے ہیں...... وہ بھلے لوگ بھی شاموں میں چپ' آہستگی کے ساتھ اس حجرے سے منہ چھپائے سیدھے حویلی کو نکل جاتے تھے۔

منا' کیا کیا بتاؤں کہ انکے دیئے ہوئے روپوں سے بھرے چاندی کے توڑوں کا ہم

کرتے کیا تھے۔ ہم چار چار وقتوں کے بھوکوں نے ایک ایک روٹی...... چاندی کا پورا پورا توڑا دے کر لی ہے۔ بس اس طرح خرچ ہو جاتا تھا اور ان بھلے لوگوں کے خمبوں سے اناج کی بساند یہاں تک اٹھ آتی تھی اور یقین کرنا' میں نے اپنی گور کیوں بھاری کرنی ہے......''

نیک لوگو! میں نے یہ سب سن کر کروٹ لی تھی اور سخت حیران ہوا تھا۔ دیر تک جب بابا چپ چاپ اسی طرح پڑا رہا تھا اور اس کے سانس کی دھوکنی چلنی رک گئی تھی تو میں نے اسے آوازیں دی تھیں اور میں نے عہد کر لیا تھا کہ آج حویلی جا کر خمبے میں گھس جاؤں گا اور ڈاٹ نکال کر سڑتے ہوئے اناج کی بساند کو راستہ دوں گا۔ میں نے سوچا تھا اور سمجھا تھا کہ بابا سو گیا ہے۔ میں پنجوں کے بل چلتا ہوا حجرے سے باہر آ گیا' سامنے ہماری حویلی تھی' جہاں بساند قید تھی۔

دروازے پر لیاری بندھی تھی اور میرا باپ گھر سے نکلتے وقت اونچے دروازے سے سر نیوڑھائے شملے کو بچا رہا تھا۔ میں دوڑ کر باپ کی ٹانگوں میں جا گھسا اور میں نے کہا:

''بابا نور محمد اکہہ رہا تھا کہ اس نے ایک روٹی چاندی کا پورا توڑا دے کر خریدی ہے۔''

''میرا باپ اپنی مونچھوں میں مسکرایا' پھر پوچھنے لگا۔ وہ جھوٹا ہے کہاں؟ جا کے دیکھ' کہیں واقعی اپنی گور تو بھاری نہیں کر گیا۔''

میں حجرے کی سمت دوڑنے لگا۔ پھر ہم دونوں اندر گئے تو نور محمد اگزر گیا تھا۔

بھلے لوگو' میں نے جھوٹ بول کر اپنی گور کیا بھاری کرنی ہے۔ جوڑ میرے جواب دے گئے ہیں' سن میں سکتا نہیں' آنکھوں میں موتیا اتر آیا ہے' کہیں تم لوگ بھی کہنیوں کے بل لیٹے لیٹے تھک تو نہیں گئے اور مسجد کے پچھواڑے چلے گئے ہو۔

پتا نہیں شاید آپ لوگوں کو ابھی آنا ہو۔ ہرے رنگ کی صدری میں' روتی کرلاتی کھیڑیاں اور واہ واہ بودے اور دونوں گھوڑیوں کی باگیں ہاتھوں میں۔

میں اٹھوں' اپنا خالی توڑا تلاش کروں' کہیں لوٹ میں پیچھے ہی نہ رہ جاؤں۔

ایک بہت قدیم کہاوت ہے کہ لفظ دھرتی کی بیٹی ہے۔ مراد یہ کہ اس کی ایک کشش ثقل ہوتی ہے جو تصورات کو بالا بالا اڑ جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ تجریدی اور علامتی افسانوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ ان میں بعض اوقات لفظ اپنی کشش ثقل سے محروم ہو جاتا ہے اور مرکزی خیال لفظ اور پلاٹ کی بنیادوں سے منقطع ہو کر تجرید کی دھند میں غائب ہونے لگتا ہے۔ مرزا حامد بیگ ان چند انتہائی خلاق افسانہ نگاروں میں سے ایک ہیں جنہوں نے لفظ کی وساطت سے دھرتی کے ساتھ ایک مضبوط رشتہ قائم کیا ہے مگر کہانی کو محض ارضی سطح پر تعمیر کرنے کے بجائے اس میں علامتی ابعاد بھی شامل کر دیے ہیں۔ مرزا حامد بیگ کو لفظ کے استعمال کا ایک خاص سلیقہ ہے۔ ان کے ہاں کردار کی پیشکش، واقعہ کا بیان حتیٰ کہ لفظ کے استعمال تک میں ایک فعال، جاندار بلکہ ایک حد تک تشدد رویہ ملتا ہے جو زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا نتیجہ ہے۔ بحیثیت مجموعی مرزا حامد بیگ کے افسانوں کا ذائقہ سب سے الگ اور جدا ہے۔ جب میں نے ان کا پہلا افسانہ پڑھا تو بے اختیار میں نے کہا......

''مرزا حامد بیگ ایک پیدائشی کہانی کار ہے''۔ اور میں اپنی اس رائے پر قائم ہوں۔

(وزیر آغا)

ISBN: 969-496-153-x